جدید غزل
(ایک تجزیاتی مطالعہ)
اشہد کریم الفت

جدید غزل

ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر اشہد کریم اُلفت

احمد پور، رفیع گنج، اورنگ آباد (بہار) 824125

جدید غزل

(C) شفقت جمیل

سنِ اشاعت	:	۲۰۰۷ء
تعداد	:	ایک ہزار
صفحات	:	128
قیمت	:	۲۰۰ روپے
سرورق	:	ممتاز احمد
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	**پرنٹ آرٹس** کریم گنج، گیا
طباعت	:	**پرنٹ آرٹس** کریم گنج، گیا

کتاب ملنے کے پتے:

اشہد کریم الفت

احمد پور، رفیع گنج، اورنگ آباد (بہار) موبائل نمبر:9934910213

بک امپوریم سبزی باغ، پٹنہ۔۴

جمال بک ڈپو ، باری روڈ، چھتہ مسجد، گیا

انتساب

ان تمام کرم فرماؤں کے نام

جن کی مہربانیوں نے مجھے یہ حوصلہ بخشا۔

Aurangzeb345@gmail.com

فہرست مضامین

عرض حال

''جدید غزل۔ایک تجزیاتی مطالعہ'' نہایت اہم موضوع ہے کیونکہ اردو زبان میں شعری ادب کی پہچان غزل ہی کے حوالے سے ہوتی ہے۔غزل آج سالہا سال کے سفر کے بعد اپنے بام عروج پر چڑھتی دکھائی دیتی ہے اور غزل جس کی پہچان کبھی محبوب کے ذکر خیر سے تھی آج اپنے لکشمن ریکھا سے باہر نکل چکی ہے۔اب یہ حسن یار کی بانہوں سے نکل کر زندگی کے تمام گوشوں کو چراغِ فکر سے روشن کر رہی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے اس دور میں غزل نے بھی برق رفتاری دکھائی ہے اور اپنے عہد کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہے۔ اس لئے میں نے اپنا موضوع سخن ''جدید غزل'' کا انتخاب کیا۔

جدید غزل کا اگر شجرہ تیار کیا جائے تو کئی کتابیں تیار ہو جائیں اور فکر وفن پر بات کی جائے تو ایک ادارہ ہی کھولنا پڑے۔ بڑا مشکل ترین کام ہے۔نقد سخن کی پیمائش کے باٹ بٹکھرے بھی الگ الگ ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ غزل کہیں نیم وحشی صنف سخن ہے تو کہیں آبروئے فن بھی ہے۔اس کھائی کو آج تک ہمارے نقاد نہیں پاٹ سکے ہیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں ہزاروں دراڑیں پڑ چکی ہیں جتنے منہ اتنی باتیں

ہیں میں ان باتوں میں نہیں پڑنا چاہتا ہوں اور طفلِ مکتب کی حیثیت ہی کیا ہے۔

میرے اندر کا قلم کار بہت دنوں سے مجھے کچھ لکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ Ph.D. کے بعد درس و تدریس کی راہ ہموار کرنے کے لئے میری ضرورت تھی۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد میری محنتوں کا یہ ثمرہ ہے۔ پتا نہیں میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ یہ بات تو اہل سخن اور ارباب نظر ہی بتا سکتے ہیں۔ پھر بھی مجھے اپنے مضمون کی تشنگی کا شدید تر احساس ہے اور انشاءاللہ اگر وقت اور حالات نے ساتھ دیا تو اس گفتگو کو مزید نکھارنے کی کوشش کروں گا اور تلاش و جستجو جاری و ساری رکھوں گا پھر بھی اس کتاب سے اگر کسی کی دل آزاری ہوتی ہے تو میں اپنی چشم پوشی اور کم علمی کی معذرت چاہتا ہوں اور ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس ناچیز کی کسی بھی طرح کی مدد کر کے حوصلہ افزائی کی۔ اہل سخن اور اہل نظر سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ وہ اپنی آراء سے نوازیں جس سے بندہ ناچیز کو نکھرنے اور سنورنے کا شعور حاصل ہو سکے۔

آپ کا

اشہد کریم الفت

اِستقبال

اشہد کریم الفتؔ غزل کے عاشق صادق ہیں ــــــ اور ایسے عاشق ہیں کہ ان کی شخصیت پر بھی لطافت و نفاست، اس کی کم سخنی بلکہ نیم سخنی، اس کی مروت، حلاوت، اس کے ایجاز و اختصار اور اس کے رکھ رکھاؤ کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ من تو شدم تو من شدی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ وہ کامیاب غزل گو شاعر ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کی دیر آمیزی اور کم آمیزی نے اس میدان میں ہنوز انہیں اس تناسب سے روشناس خلق نہیں ہونے دیا ہے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ میں اپنے دعوے کی دلیل میں فی الفوران کے مندرجہ ذیل چند اشعار پیش کر سکتا ہوں۔

کیوں چاندنی سے دھوپ کا رشتہ کیا گیا
شائد کہ ذات پات غزل کی نہیں رہی

گاؤں بھی جل رہے ہیں شہر کے ساتھ
آگ نفرت کی ہر مکان میں ہے

ہم غریبوں کی آرزو ہی کیا
صرف جینے کی آس ہوتی ہے

حیرت ہے زمانے سے ڈرتا نہیں کیوں الفتؔ
شیشے کا بدن لے کر پتھر سے جھگڑتا ہے

خوشبو کی جلترنگ ہے سر دھن رہے ہیں ہم
جیسے کسی غزل سے غزل سن رہے ہیں ہم

مست خرام ناز کی آواز آتی ہے
آنکھوں میں پھر سے خواب نئے بن رہے ہیں ہم

تجھ سے بچھڑ کر زندہ رہنا — ہے ناممکن کیسے رہوں
رات کھلے آکاش کے نیچے — تارے گن گن کیسے رہوں

وہی الجھن، گھٹن، آنسو لئے دن بھر بھٹکتا ہوں
مگر جب رات ہوتی ہے مِرا دل کیوں دھڑکتا ہے

میں اپنے آپ میں کھویا ہوں اب کوئی نہیں مجھ میں
خود اپنی ذات ہوتی ہے مِرا دل کیوں دھڑکتا ہے

اشہد کریم الفت کے یہاں ان سے بہتر، بہت بہتر اشعار بھی ہوں گے۔ میں نے مشتے نمونہ ازخروارے کی طرح چند اشعار پیش کردیئے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ غزل گوئی کے آرٹ پر دسترس رکھتے ہیں۔ سادگی کے ساتھ دل آویزی، روایت کے ساتھ جدت کی تلاش، اجتماعی دکھوں کی صلیب کو اپنے دوش کا بار بنانے کا حوصلہ، چھوٹی سی آرزو میں معنوی وسعتوں کی یافت، عشق کی بے چارگی، خوابوں کے سہارے زندگی گزارنے پر رضا، ایک بے نام سی اداسی اور ہر آن کا کرب۔ غرض غزل جن

اوصاف سے آبروئے فن بن سکتی ہے وہ سب کسی نہ کسی درجے میں ان کے یہاں موجود ہیں۔ وہ ابھی نو جوان ہیں اور اس میدان میں انھیں طویل مسافت طے کرنی ہے۔
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک۔

یہ غزل سے الفتؔ کی بے پناہ محبت ہی ہے کہ انھوں نے عہد حاضر کی غزلیہ شاعری کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ غزل نے جب سے اب تک ایک لمبا سفر طے کرتے ہوئے فکری احتساسی، موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطحوں پر اپنے اندر اتنے تنوعات اور تغیرؔات پیدا کر لئے ہیں کہ ان سبھوں کا احاطہ کرنا بھی آسان نہیں۔ اشہد کریم الفتؔ نے اس سلسلے میں جو کوشش کی ہے اسے حرف آخر نہیں کہا جا سکتا لیکن پیش نظر کتاب سے جدید غزل کے چند اہم نقوش ضرور واضح ہو جاتے ہیں۔ غزل ایک ایسے معشوق کی طرح ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ

بسیار شیوہاست بتاں را کہ نام نیست

الفتؔ نے جدید غزل کا جو انتخاب پیش کیا ہے اور اپنی تحریر میں ان کے جو خصائص اور تجزیات پیش کئے ہیں وہ اس نوع کی دوسری کوششوں کو مہمیز کریں گے۔ مجھے اس کا یقین ہے۔

میں اس کتاب کا استقبال کرتا ہوں

علیم اللہ حالیؔ
وھائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

جدید غزل ۔ ایک تجزیاتی مطالعہ

غزل اردو زبان ادب کی محبوب ترین صنف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ناقدانِ سخن نے کبھی اسے ''نیم وحشی'' کہا تو کبھی اسے ''آبروئے فن'' کہا، میں ان باتوں میں پڑنا نہیں چاہتا ہوں، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ذکرِ محبوب جب ہو تو بات عقل و خرد کی بھی ہوتی ہے اور جوشِ جنوں کی بھی ہوتی ہے اور اس صنفِ کافر کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ دراصل یہ مونالیزا کی مورت کی طرح فکر و فن کی بے مثال نشانی ہے۔ جس نے اسے جس انداز میں، جس نظریے کے ساتھ دیکھا اسی تناظر میں پایا۔ ماں کے روپ میں ماں، بیوی کے روپ میں بیوی، بہن کے روپ میں بہن، محبوبہ کے روپ میں محبوبہ نظر آئی، اب دیکھنے والوں کے زاویہ نگاہ پر منحصر ہے کہ ان کی نگاہ کس نقطے پر ٹھہرتی ہے۔

زمانے کے ساتھ غزل نے بھی اپنا روپ رنگ، شکل و شباہت، نقش و نگار بدلا ہے۔ اس کی پہچان نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ چشم، زلف، لب و رخسار کی بانہوں سے نکل کر یہ آج حیات و کائنات کی تمام وسعتوں کو چھو چکی ہے اور اپنے دامن میں ہر طرح کے فکری، فنی، سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی سائنسی علوم کے مضامین کو سمیٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔

روزِ اوّل ہی سے اس کے دامن سے عاشق نامراد لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں اور محبت کا دم بھرنے والوں کی کمی نہیں ہوئی۔ یوں تو ''خدائے سخن'' کا دعویٰ کرنے والے سر پھرے بھی بہت ہیں مگر حقیقت تو یہی ہے کہ تیشۂ فن لے کر دودھ کی نہریں نکالنے والے فرہاد خال ہی خال نظر آتے ہیں۔ جنھیں اس کے گیسوئے عنبریں کی ہوا رخ زیبا کا دیدار ،نرگسی آنکھوں کے جام، شربتی ہونٹوں کے لمس نصیب ہوئے اور اس خوش جمال کے عاشقین کی فہرست میں ان کے نام سنہرے حروف سے لکھے گئے۔

یہ شمعِ آرزو کبھی بھی پروانوں کے بغیر نہیں روشن ہوئی ہر دور میں کسی نہ کسی سر پھرے نے اپنے خونِ جگر سے اس کے رخِ روشن کو نکھار دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو غزل کی تاریخ پر سرسری نگاہ ڈالتا چلوں، جس سے ذہن و دل میں اس جانِ تمناّ کے نقش و نگار ابھرتے چلے جائیں۔ اور میں اپنے مضمون سے قریب تر ہوتا جاؤں۔

جب حضرت امیر خسرؔو نے ''نہ تاب لیہو لگائے چھتیاں'' کہہ کر اردو غزل کی بنیاد ڈالی تو اس وقت انھیں بھی اس کا اندازہ نہیں ہوگا کہ یہ کافر کتنوں کا کلیجہ کاٹ کر رکھ دے گی اور جگر پاش پاش کر دے گی۔ آج ہر شاعر بے دھڑک اسی کافر کو دیکھ کر مسلمانی کا دعویٰ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ خسرو کے بعد ولؔی بڑا معتبر نام ہے اور مکمل غزل گو کا پہلا سہرا ولؔی کے سر بندھتا ہے۔ ولؔی نے اس کی پرورش اور پرداخت بھی کی۔ ولی کے بعد سودا نے اسے سرمستی و سرشاری عطا کی۔ دردؔ نے حقیقت و معرفت سے روشناس کیا تو میر تقی میرؔ نے اپنے کمالِ فن سے اسے نقطۂ عروج پر پہنچا کر ''خدائے سخن'' کا تاج بھی حاصل کیا۔ ذوق نے تراش و خراش کر خط و گیسو درست کئے۔ غالبؔ نے فکر و فن سے اسلوب و معنیٰ کو جامِ دو آتشہ کر دیا جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مومنؔ نے عشوہ و ناز کی نت نئی شوخیاں بھر دیں جس کی سحر کاری آج بھی موجود ہے۔ داغؔ نے سلاست و سادگی عطا فرمائی۔ امیر مینائیؔ نے بھی اسی فکر سے چراغ سے چراغ جلایا۔ مصحفؔی، جراتؔ، آتشؔ، ناسخؔ، رنگینؔ، شوقؔ، انشاء کس کس کی اٹھکیلیوں اور بیزاریوں کا ذکر کروں شاد نے تڑپ کر تسکین دل کی شادمانی کا نسخہ ڈھونڈا تو حالؔی نے خوب سے خوب تر کی جستجو دی۔ اکبرؔ نے طنز و مزاح کی پھلجڑیاں چھوڑیں تو اقبال نے خودی سے روشناس کیا۔ جوش نے بے خودی کا جوش دکھلایا۔ فراق نے شبنمی احساس کی بوندوں سے گل حیات کو تازگی بخشی۔ حسرتؔ و جگر نے چپکے چپکے رومانیت کی پر کیف و پر بہار فضائیں قائم کیں۔ فیض و مجاز نے ایک نئی حرارت بخشی، ناصر کاظمی نے جدید اسلوب سے طرزِ نگارش کی نئی نئی راہیں کھول دیں۔ اداؔ جعفری، داراب بانو وفا، پروین شاکر، شبنم شکیل، ساجدہ

طرف ''سچی جدیدیت'' کا تجزیہ کر کے اس کی انفرادی خصوصیت کی
نشاندہی کرتی ہے۔''

دیوندر اِسر نے اپنے ایک مضمون ''مابعد جدیدیت کا منظر نامہ'' میں یوں فرمایا ہے۔

''آخر جدیدیت کا خاتمہ ہو گیا واقعی! اب مابعد جدیدیت
کا زمانہ ہے۔ مابعد جدیدیت عصر حاضر کی فکر ہے، تہذیب
اور جمالیات کی نشاندہی کرنے والی ایک ہمہ گیر اصطلاح ہے۔
جدیدیت کی طرح اس کے مفاہیم بھی مسلسل بدل رہے ہیں۔ اس
میں تضادات کی کمی نہیں لیکن پھر بھی اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ
ہمارا عہد جدیدیت کے دور سے نکل کر مابعد جدیدیت کے دور میں
داخل ہو چکا ہے۔''

گوپی چند نارنگ اپنے ایک انٹرویو میں یوں بیان فرماتے ہیں:

''بیشک جدیدیت بھی روشن خیالی کا ایک حصہ تھی لیکن افسوس کہ
جدیدیت کی نظریاتی تشکیل جس طرح اردو میں کی گئی ایسا لگتا ہے
کہ ترقی پسند انداز فکر کی ضد میں کی گئی۔''

کوثر مظہری جو نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اپنے مضمون ''جدیدیت و جودیت کا چہرہ'' میں
یوں رقم طراز ہیں:

''اردو ادب میں جدیدیت 60ء کے آس پاس شروع ہوئی ہے
جب کہ مغرب میں اس سے تیس برس قبل ہی ۱۸۹۰ء سے شروع ہو
کر ۱۹۳۰ (بقول Roger Fowler) میں ختم ہو جاتی ہے جب
جدیدیت مغرب میں دم توڑ چکتی ہے تو اردو میں چھ برسوں بعد
۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک خواب گراں سے بیدار ہوتی ہے اس

تصویر ادھوری ہے۔

اب میں اپنے مضمون ''جدید غزل۔ایک تجزیاتی مطالعہ'' کی طرف بڑھ رہا ہوں اور اس کے پس منظر اور پیش منظر میں بات کرنا چاہتا ہوں دراصل جدیدیت کیا ہے؟ اور ادب کی یہ کون سی اصطلاح ہے؟ یا پھر مابعد جدیدیت کیا ہے؟ ایسے انگنت سوالات میرے ذہن ودل میں شیطانی وسوسے کی طرح اُبھرتے جاتے ہیں اور میں ان کا حل تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ پروفیسر آلِ احمد سرور نے اپنی کتاب ''نظر اور نظریے'' میں جدیدیت پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

> ''دراصل Modernism یا جدت پرستی جدید کو ستا کرتی ہے یہ Modernlatory یعنی نئی چیز یا نئی لہر کی پرستش بن جاتی ہے۔ میں جدت پرستی کو اچھا نہیں سمجھتا، ہاں جدیدیت کا قائل ہوں اور اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔
>
> (نظر اور نظریے صفحہ ۱۴۱)

اسی کتاب میں انہوں نے جدیدیت کی تاریخ بھی کچھ اس طرح بیان کی ہے۔

> ''ہمارے ملک میں عمومی طور پر جدیدیت انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے یہ جدیدیت مغرب کے اثر سے آئی ہے یورپ میں نشاۃ الثانیہ نے ازمنہ وسطیٰ کو ختم کر دیا۔ ہمارے یہاں نشاۃ الثانیہ مغرب کے اثر سے انیسویں صدی کے وسط میں رونما ہوا۔ یورپ میں جدیدیت کی تاریخ چار سو سال سے زیادہ کی ہے۔ ہمارے یہاں قریب ڈیڑھ سو سال کی۔''

عنوان چشتی نے جدیدیت کی روایت پر یوں اظہار خیال فرمایا ہے:

> ''جدیدیت کی روایت ایک طرف کلاسیکی ترقی پسند اور جدید شاعری کے بعض کمزور اور جعلی نمونوں کی کی نشاندہی کرتی ہے اور دوسری

طرح زمانی بعد کے لحاظ سے مغرب کی جدیدیت اور اردو کی
جدیدیت میں تیس برسوں کا فرق ہے۔البتہ مغرب میں جدیدیت
کے آغاز اور یہاں کی جدیدیت کے آغاز میں ستر برسوں کا زمانی بعد
ہے۔" (جواز دا انتخاب صفحہ ۱۰)

احمد کفیل کا جدیدیت کے پس منظر میں نظریہ یوں ہے:

"اردو ادب میں جدید شاعری کی ابتداء انیسویں صدی کے آخر سے
مانی جاتی ہے جب کہ سرسید، آزاد، حالی کے ذریعہ ادب میں جدت
کی تحریک چھیڑی گئی تھی۔"

اور پیش منظر میں یوں فرماتے ہیں:

"آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک اپنا دم توڑنے لگی اور جدیدیت کا
بول بالا شروع ہوا۔"

(حسن نعیم اور نئی غزل صفہ ۶۱)

عین تابش اپنے مضمون" غزل کا مزاج تخلیقیت اور امکانات" میں ترقی پسندی
جدیدیت، مابعد جدیدیت ان ساری اصطلامات کو یوں رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاعری اور غزل کی ہر گفتگو آج کی اور ابھی کی گفتگو ہے ایسی ہر
گفتگو میں اہمیت ادوار، تحریکات اور رجحانات کی کم اور معنویت،
آفاقیت اور جمالیاتی ہمہ گیریت کی زیادہ ہے۔"

(ماہنامہ آج کل نومبر ۲۰۰۵ء صفحہ ۱۶)

ان تمام باتوں کے مطالعہ و مشاہدہ سے پتا چلتا ہے، ہر آنے والا زمانہ گزرے ہوئے
زمانے سے جدید ہے۔سچا اور کھرا فن ہیرے کی مانند ہے اس کی قدر و قیمت کبھی نہیں کم
ہوتی ہے۔دنیا کا کاروبار اسی طرح چلتا ہے۔فطرت بھی انھیں باتوں کی غمازی کرتی ہے۔
ہر نیا موسم پرانی یاد سے جڑا ہوا ہے اور اپنی شناخت الگ بھی قائم کرتا ہے۔پرانے پتے

جھڑتے ہیں، نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں، بہار کے بعد خزاں خزاں کے بعد بہار، رات کے بعد دن، دن کے بعد رات لیل ونہار کی یہ گردشیں جاری وساری ہیں۔کوئی بھی فن ہو نیا فن کار پرانے فنون کو پیش نظر رکھ کر اپنی عقل سلیم سے محنت ومشقت کے ذریعہ ایک نئے فن کی ایجاد واختراع کرتا ہے یا اس میں رنگ وروغن بھرتا ہے اور یہی اس کی پہچان بن جاتی ہے۔اپنے پیش روؤں کی ڈگر پہ چل کر یا ان کے راستے کو دیکھ بھال کر ان ہی راستوں میں سے ایک الگ راہ نکالنا میرے خیال سے اسی کو آپ جدیدت کا نام دے سکتے ہیں اور فکروفن کے نقش ونگار اسی طرح سنورتے اور نکھرتے رہتے ہیں۔

آزادی کے بعد غزل نے ایک نیا رنگ و آہنگ اختیار کیا اور نئے نئے رجحانات سامنے آئے پرواز تخیل کی کئی راہیں کھلیں۔ان پچاس ساٹھ برسوں میں دنیا نے حیرت ناک کرشماتی کارنامے انجام دیئے۔لازمی طور پر تمام علوم وفنون پر ان کا اثر ہونا تھا۔غزل بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکی اور اس نے بھی اپنے جامے کو دراز کیا اور نئی نئی فکرو آگہی کی اڑان کو سلام کیا اور بڑھ کر گلے سے گلے لگایا۔پرتپاک خیر مقدم کیا اس نئے موسم کی آواز پر غزل لبیک کہتی ہوئی نظر آتی ہے۔جب ہم جدید غزل کے ان پہلوؤں کو تلاشتے ہیں جن سے جدیدیت کی پہچان ظاہر ہوتی ہے تو نئی غزل کا یہ امتیاز ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے۔

آیئے نئی غزل کے ان پہلوؤں کی طرف جھانکتے چلیں جن سے فکروفن کی نئی روشنی پھوٹتی ہے اور یہ روشنی ہمیں فکروآگہی کی نئی نئی راہوں سے متعارف کراتی ہے۔جس سے زندگی کی دھڑکن کا پتا چلتا ہے۔زمانے کی گردشیں دکھائی دیتی ہیں۔دنیا کے نشیب و فراز نظر آتے ہیں۔کل اور آج کا فرق سمجھنے کے لئے دونوں عہد کا مزاج چند اشعار کے آئینے میں ملاحظہ کیجیے۔ہم دونوں کی تفریق پر بھی روشنی ڈال رہے ہیں۔جس سے جدید اور قدیم غزل کا امتیاز آسان ہوجاتا ہے:

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میرؔ

مرے گھر میں ماتم سا ہوتا رہا
مگر میرا ہمسایہ سوتا رہا
(نامعلوم)

دونوں اشعار میں فرق نمایاں طور پر واضح ہے اور یہ فرق دو الگ الگ ادوار کی تہذیب و تمدن کے تغیر و تبدل کی جھلک ہے۔ ہر عہد کا ایک الگ مزاج ہوتا ہے۔ اس کے مسائل اور الجھنیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ پہلا شعر انسانی قدروں کا آئینہ دار ہے۔ دوسرا شعر انسانی قدروں کی پامالی کا آئینہ دار ہے۔ پہلا شعر پڑوسیوں کے حقوق کی پاسداری، صبر و تحمل کی تلقین اور محبت و اخوت کا درس دیتا ہے۔ دوسرا شعر بے مروتی، خودغرضی، لاپرواہی کی المیہ تصویر کھینچتا ہے۔ وقت بڑا قیمتی شئے ہے جو پہلے شعر میں فراہم ہے۔ انسان کو دوسرے کا دکھ درد سمجھنے کی مہلت ہے۔ جس سے محبت اور بھائی چارگی کی فضا قائم ہوتی ہے۔ دوسرے شعر میں وقت مصروف ہے۔ جس سے خودغرضی، چشم پوشی، لاپرواہی کی تصویر اُبھرتی ہے۔

ہوش وحواس تاب وتواں داغؔ کھو چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا
داغؔ

خواب وخوشبوئے طلب، رنگ ہوس، ناز و وفا
سارا سرمایا گیا، چلیئے یہاں سے چلیئے
مظہر امام

دونوں شعر کا فرق نمایاں طور پر اُبھرتا ہے حالانکہ ایک ہی بات ہے۔ صرف کہنے کا انداز

الگ الگ ہے۔ جیسے ایک آدمی مر گیا اور فلاں شخص مر گیا میں فرق ہے۔ ایک آدمی مر گیا کہنے میں صرف موت کی تصویر اُبھرتی ہے اور فلاں شخص مر گیا کہنے میں موت کے ساتھ ساتھ اس شخص کی شخصیت بھی اُبھرتی ہے۔ داغ کا شعر فطری ہے اور حقیقی پیش کش ہے۔ سیدھے سادے لفظوں سے زندگی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ پیری کی ناتوانی ایک ایک لفظ سے جھلک رہی ہے۔ موت کی دستک صاف سنائی دیتی ہے مگر مظہر امام کے شعر میں جوانی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ خواب، خوشبوئے طلب، رنگِ ہوس، ناز و وفا، سارے سامان جوانی کی توانائیاں لئے ہوئے ہیں۔ جن کے اندر زندگی کی امنگیں اور ترنگیں لہراتی ہیں۔ ''چلئے یہاں سے چلئے'' کا ٹکڑا بھی تجسس کی فضا قائم کرتا ہے۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میؔر

میاں سفر کا کہاں اختتام ہوتا ہے
اِک اور راہ نکلتی ہے خاک تربت سے

عین تابش

میؔر کے خیال کو عین تابش نے کتنا بلند کر دیا ہے۔ لیکن دونوں میں نازک سا فرق اُبھرتا ہے۔ میؔر کے یہاں زندگی کے سفر کے بعد ایک ٹھہراؤ ہے، دم لینے کی گنجائش ہے۔ تھکان ہے مگر عین تابش نے زندگی کے سفر کا تسلسل برقرار رکھا ہے اور خاکِ تربت سے ایک اور راہ نکالی ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومؔن

پاس رہ کر بھی دور دور رہے
ہم نئے دور کی محبت تھے

بشیر بدر

مومن کا شعر ضرب المثل بن گیا اور شہرہ آفاق حیثیت رکھتا ہے۔ نثری ترتیب ایسی ہے کہ سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔ بشیر بدر کا شعر بھی سہل ممتنع کی تصویر ہے۔ مومن جیسی خوبی نہیں ہے مگر بشیر بدر نے اس خیال کا دوسرا پہلو نکالا جو آج کی حقیقت سے زیادہ قریب تر ہے اور اس کی معنویت حقیقت کی زیادہ عکاس ہے:

اب کے جنوں میں فاصلہ شائد نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

(نامعلوم)

کیا تھا سوال وصل میں پنہاں کہ اس نے آج
دامن کو ایک پل میں گریبان کر دیا

ظفر اقبال

دامن اور گریبان کے موضوع پر پہلے شعر کو شہرہ آفاق مقام حاصل ہے اور ایسا لگتا تھا کہ یہ باب بند ہو چکا ہے مگر ظفر اقبال نے اسے پھر کھول دیا اور ایک نئی معنویت عطا کر دی ''دامن کے چاک میں اور گریباں کے چاک میں'' سے زیادہ لطف ''دامن کو ایک پل میں گریبان کر دیا'' میں لے آئے پہلے شعر میں جنوں خیزی کی کھلی تصویر ہے۔ دوسرے شعر میں سوال وصل کے راز پنہاں ہیں، جو زیادہ پُر لطف ہیں:

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

سیماب اکبر آبادی

کاسۂ دل سے لہو آنکھوں سے پانی لے گیا
اپنا قصہ کہہ کے وہ میری کہانی لے گیا

سلطان اختر

یہاں پہلا شعر شہرہ آفاق حیثیت رکھتا ہے۔زبان و بیان کا لطف اور معنویت کی گہرائی و گیرائی کا حسن بھی بھرپور ہے۔کہانی جو غم کا استعارہ ہے اور شاعر کا یہ غم ذات غم کائنات بن گیا ہے۔ سننے والے (زمانہ) اس کے غم کو اپنا غم سمجھ کر آنسو بہاتے ہیں۔سلطان اختر جو آج کے شاعر ہیں اس خیال کو نئی صورت میں پیش کرتے ہیں۔زمانہ بہت سفاک اور چالاک ہے۔اس لئے وہ شاعر کے غم سے پہلے اپنا غم بیان کر دیتا ہے۔جس میں شاعر کا ذاتی غم ختم ہو جاتا ہے اور اسے اپنا غم بیان کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا ہے۔جس میں وہ لہو جلا سکے اور آنسو بہا سکے کیونکہ یہ دونوں دولت زمانہ اپنا غم بیان کر کے اس سے چھین لیتا ہے اور یہ المیہ آج کی زندگی کی حقیقت کا زیادہ عکاس ہے:

شغلِ الفت کو جو احباب بُرا کہتے ہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا کہتے ہیں

میر مہدی مجروح

محبت کے بدلے محبت نہ مانگ
کہ یہ سلسلہ کاروباری نہ رکھ

صدیق مجیبی

یہاں بھی فرق واضح ہے پہلے شعر میں شاعر نے شغل الفت کو ظاہر کیا ہے جسے اس کے احباب بُرا کہتے ہیں۔اس سے شاعر کشمکش میں ہے کیونکہ یہ احباب (زمانہ) محبت سے ناواقف ہیں۔اس کی لذت سے نا آشنا ہیں یہ لوگ ظاہری صورت کو دیکھتے ہیں۔باطنی تصویر سے انجان ہیں اور یہ لوگ محبت پرست اور محبت نواز نہیں ہیں۔اس لئے شاعر کے

عمل کو برا کہتے ہیں جس سے شاعر الجھن میں پڑتا ہے۔

دوسرے شعر میں شاعر اپنے آپ کو یہ درس دیتا ہے کہ محبت اور تجارت میں فرق ہے۔ نفع ونقصان پر دھیان مت دے اور محبت کے بدلے محبت کی مانگ مت کر۔ "نیکی کر دریا میں ڈال" کا عمل اپنا، ورنہ تری محبت برباد ہو جائے گی۔ زمانے کی طرح یہ سلسلہ کاروباری نہ رکھ جیسا کہ آج کے دور میں ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ خیال آج کے زمانے کا زیادہ عکاس ہے اور زندگی سے قریب تر ہے۔

ان اشعار کی روشنی میں جدید وقدیم غزل کے لب ولہجہ، رنگ وآہنگ، نقش ونگار اور مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ آیئے جدید غزل کے چند اشعار پر ہلکی سی روشنی ڈالتے چلیں جن سے جدید غزل کی تصویر کچھ واضح ہو جاتی ہے۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

ناصر کاظمی

میرؔ، فانیؔ، فراقؔ نے بھی دکھ درد کی فطری تصویر کشی کی ہے اسی سلسلے کی جدید کڑی ناصر کاظمی سے جڑی ہے۔ زمانے کی کربناکیوں اور پھیلے ہوئے سناٹوں کی بہترین عکاسی ہے اور بالکل اچھوتا اسلوب بیان ہے۔ ایک ایک لفظ سے دکھ درد کی تازگی ٹیس مارتی ہوئی محسوس ہوتی ہے:

مسکراتی ہوئی تنہائی ہے
رات میں دھوپ نکل آئی ہے

بشیرؔ بدر

یہاں بھی ایک نیا اسلوب ایک نئی لذت بخش رہا ہے اور بالکل اچھوتا انداز بیان ہے۔ تنہائی غم کا استعارہ ہے۔ رات زخم کا استعارہ ہے۔ دھوپ، جلن اور چبھن کا استعارہ ہے۔ زخموں کی ٹیس سے غم مسکرا رہا ہے جس سے رات میں دھوپ نکلنے کا گماں ہوتا ہے۔

دیکھا نہیں ہو جس نے ترے دل کا آئینہ
کیا قیمتِ نگاہ شبِ رونمائی دے

حسن نعیم

مومنؔ و غالبؔ کی شوخیاں اور معنی آفرینی کا لطف حسن نعیم کے یہاں بہت خوبصورتی کے ساتھ ملتا ہے جس سے زبان و بیان کا حسن اور معنویت کی تازگی کا لطف و سرور پیدا ہوتا ہے اور یہ سرور قاری کے لئے لذت بخش ہے۔ یہ شعر اس بات کی دلیل ہے:

دوستوں سے ملاقات کی شام ہے
یہ سزا کاٹ کر اپنے گھر جاؤں گا

مظہر امام

دوست جس سے ملنا خوشی کی بات ہوتی ہے مگر یہاں مظہر امام نے اسے بالکل نئے تناظر میں پیش کیا ہے۔ رشتوں کی معنویت بدل گئے ہیں اسی بدلتی تصویر کا یہ شعر عکاس ہے اور حقیقت کے رنگ اُبھار رہا ہے:

حسین ابن علی کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی بھی گھروں کے اندر ہیں

شہریار

حق کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہے یہاں تک کہ حق پسندوں سے عقیدت رکھنے والے بھی۔ ان کی بے حسی کے جمود کو توڑتا ہوا یہ شعر ایک نیا منظر نامہ پیش کر رہا ہے جو بالکل اچھوتا ہے:

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

احمد فراز

نئی روشنی کی تائید کرتا ہوا شعر ہے۔حقیقت پسندی کا اعتراف کرتا ہے۔دقیانوسی خیالات کا جامہ بڑے خوبصورت انداز میں اُتارتا ہے:

رُوح سے رُوح کو ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے

عرفان صدیقی

عرفان صدیقی کا کمال یہ ہے کہ ان کے اشعار فکر و معنی کے بیک وقت کئی باب کھولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس شعر میں بھی یہ بات محسوس کی جاسکتی ہے ''رُوح'' محبت، حقیقت، معرفت اور روحانیت سے روشناس کراتی ہے''بدن'' دنیا اور اسکی مادیت کا فانی منظر پیش کرتا ہے''دیوار'' مصیبت، نفرت اور سماج کی مٹتی ہوئی تصویر ہے۔یہاں حقیقت بڑے حسین انداز میں ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

موم کے پتلے تھے ہم اور گرم ہاتھوں میں رہے
جس نے جو چاہا ہمیں ویسا بنا کر لے گیا

منظور ہاشمی

سادہ لوح نرم انسان پر زمانے کی سختی کو بالکل اچھوتے انداز میں پیش کرتا ہوا شعر ہے:

کٹتے جاتے ہیں ہرے پیڑ بھی زلفوں کی طرح
اب کوئی سایہ ترے شہر کی راہوں میں نہیں

عنوان چشتی

ہرے پیڑ اور زلفوں کا کٹنا خطرے کی علامت ہے جہاں پیڑ کا کٹنا انسانیت کے لئے خطرہ ہے وہیں زلفوں کا کٹنا تہذیب کے لئے خطرہ ہے۔دونوں سے آج دنیا تباہی کے راستے پر ہے، انوکھا تجربہ ہے:

خشک پتوں کو چمن سے یہ سمجھ کر چن لو
ہاتھ شادابیٔ رفتہ کی نشانی آئی

مخمور سعیدی

"خشک پتے گزرے بہار کی نشانی ہیں اور آتی بہار کا پیغام بھی اس لئے خزاں کے ان جھونکوں سے گھبرانا نہیں چاہئے:

تلوار ایسے اس کے بدن میں اُتار دی
جیسے کہ آدمی نہیں وہ نیام تھا کوئی

ظفر اقبال

تلوار اور نیام سے آج وحشت پن کی انوکھی تصویر اُبھرتی ہے۔ ظلم اور بربریت انتہا پر ہے۔ آدمی نیام کی صورت ہوگیا ہے اور ظلم کھلی تلوار بن کر ہے۔

کتنی مجبور تشنگی ان کی
نل پہ بیٹھے ہیں اونگھتے برتن

پرکاش فکری

مفلسی کی سچی تصویر کشی ہے غزل میں افسانوی زبان کا لطف ہے اور منظر نامہ بھی ملتا ہے:

ناشناسی کا ہمیشہ غم رہا
آئینہ بھی اپنا نامحرم رہا

علیم اللہ حالیؔ

قدر شناسی کا ہر شاعر بھوکا ہوتا ہے۔ میرؔ نے بھی گل کی بے خبری پر حیرانی ظاہر کی ہے یہاں بھی آئینہ کی بے خبری کو علیم اللہ حالیؔ نے بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے، جس سے معنویت میں گہرائی و گیرائی بھی پیدا ہوتی ہے۔

عجیب بھول بھلیاں ہے جستجو خود کی
ہر ایک نقش قدم انحراف کرتا ہے

مظفر حنفی

زندگی کی جدو جہد میں انسان ٹوٹتا بکھرتا جارہا ہے۔ جس میں اُسے اپنی پہچان بنانی مشکل نظر آرہی ہے۔ زمانے کی بھول بھلیاں میں سے نکلنا آسان نہیں ہے یہ ایسی راہ ہے جہاں نقش قدم بھی ساتھ نہیں دے رہا ہے۔

عمر بھر بیٹھ کے رونا کوئی آسان نہیں
اپنی یادیں بھی لئے جاؤ بچھڑنے والو

سلطان اختر

کتنا حسین پیکر اظہار ہے۔ تنہا پہاڑ جیسی زندگی گزارنا آسان نہیں ہے۔ تصوراتی دنیا اور حقیقت میں فرق ہے:

تم سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان بہت شرمندہ ہیں

افتخار عاکف

سلطان اختر کے احساس کا دوسرا منظر کچھ اس طرح ملتا ہے جو اور کسک لئے ہوئے ہے۔ احساسِ ندامت کا حسین پیرایۂ اظہار ہے۔

چند لمحے کو ہی ہوتی ہیں مصور آنکھیں
زندگی روز تو تصویر بنانے سے رہی

ندا فاضلی

اور کبھی کبھی آنکھوں کی مصوری یادگار لمحہ چھوڑ جاتی ہے جو زندگی کے لئے نا قابلِ فراموش ہو جاتا ہے:

آرزو جینے کی تھی امکان جینے کا نہ تھا
خواہشیں تھیں صف بہ صف سامان جینے کا نہ تھا

صدیق مجیبی

غالبؔ کے جیسی ہزاروں خواہشیں ہر انسان سجاتے پھر رہا ہے مگر مجبوریوں نے اسے

جینے کے قابل بھی نہیں رکھا ہے ارمان تو بہت ہیں لیکن امکان ہی نہیں ہے۔ امید کی روشنی گل ہوئی جاتی ہے۔

گرتے ہوئے پتوں کی صدائیں مرے دل سے
کہتی ہیں کہ تو نے کبھی ہجرت نہیں دیکھی

اسعد بدایونی

موت کا یہ تاثر جو جدید شاعری میں بہت کم دکھائی دیتا ہے ایک نئے لب و لہجے میں نمایاں ہے:

میں برگ برگ اس کو نمو بخشتی رہی
وہ شاخ شاخ مری جڑیں کاٹتا رہا

•

پروین شاکر

پروین شاکر کی نسوانی آواز جو اپنے حقوق کی احتجاج کرتی ہوئی ملتی ہے اردو شاعری میں ایک نئی جہت کے باب کھولتی ہے۔ یہاں عورت کے استحصال اور قربانیوں کو محسوس کیا جاسکتا ہے:

خوشبو کو میری روح ترستی رہی مگر
دل مانتا نہیں کہ وہ کاغذ کا پھول ہے

رنگ برنگی دنیا کی دلفریب توبہ شکن ادا اور اس کے کھوکھلے پن کا اظہار بڑی سادگی و پرکاری کے ساتھ برتا گیا ہے۔ حقیقت واضح ہونے کے بعد بھی حقیقت قبول کرنا مشکل ہے:

بدن کے لمس میں بجتی سی جلترنگ سنیں
لہو کی بوند میں رقص شرر کو یاد کریں

زاہدہ زیدی

غالب کا لہو زاہدہ زیدی کی رگوں میں دوڑتا پھرتا ہوا نئی گرماہٹ بخش رہا ہے۔ جس سے

عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے اور لہو کی بوند میں رقص شرر کی یاد بڑا لطیف جذبہ پیش کرتا ہے:

ہم ہجر ماہ وسال سے آگے نہیں گئے
خوابوں میں بھی خیال سے آگے نہیں گئے

شبنم شکیل

رات بھر چل کر ڈھائی کوس کا سفر طے کرنا بلند بانگ دعوے کی پول کچھ اس طرح کھولتا ہے اور ہمیں مزید جدوجہد کی ترغیب بھی دیتا ہوا یہ احساس بالکل اچھوتا ہے:

کوئی بتاؤ کہ اس کاروبار ہستی میں
وہ کیا کرے جسے سوداگری نہیں آتی

مثنیٰ رضوی

چھل کپٹ والی دنیا میں سیدھے سادے انسان کا جینا بہت مشکل ہے۔ شریف انسان ہر طرف سے مارا جاتا ہے۔ شرافت کا زمانہ نہیں رہا۔

ہم دنیا کو یا دنیا ہم کو کیا سمجھے
یہ دنیاداری بھی اقبال سے ہوتی ہے

عین تابش

غریب کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ نہ دنیا اُسے جانتی ہے نہ وہ دنیا کو جانتا ہے۔ دنیاداری کے لئے دولت چاہئے۔

اُجالوں کے تعاقب کا سفر آسان ہے لیکن
چراغوں کی طرح بجھ بجھ کے جلنا سخت مشکل ہے

منظر سلطان

پروانے کی زندگی شمع کی زندگی سے بہتر ہے اس لئے روشنی حاصل کرنا آسان ہے روشنی دینا مشکل ہے:

شور کرتے ہیں پرندے پیر کٹتا دیکھ کر
شہر کے دست ہوس میں کون آری دے گیا

افتخار نسیم

اپنے فائدے اور تزین کاری کے لئے دوسروں کے گھر اجاڑ دینا اچھی بات نہیں ہے۔ ہر جگہ تجارتی ذہن استعمال نہیں کرنا چاہیئے

جلد بازی میں کئی کام بگڑ جاتے ہیں
ہر حکیمانہ عمل دیر طلب ہوتا ہے
عقیل نعمانی

نصیحت آمیز بات میں بہت پختہ کار تجربہ ہوتا ہے جیسے سونا آگ میں تپ کر کندن بنتا ہے اس خیال کی بہترین مثال ہے:

فیصلہ کوئی بھی ہو تم سوچ سمجھ کر کرنا
جلد بازی میں کسی بات پہ ہاں مت کہنا
فردوس گیاوی

فردوس گیاوی کے یہاں بھی عقیل نعمانی کے خیال کی تصویر ابھرتی ہے۔ اور تجرباتی عمل کارگر ہے

بہت جی چاہتا ہے اس کی خاطر کچھ بچار کھوں
مگر اتنی گرانی ہے کہ ہوتا کچھ نہیں ہے شاہد اختر

غریب انسان کی مجبوریاں کبھی ختم نہیں ہوتی ہیں۔ قطرہ قطرہ جمع کرنے سے بھی دریا نہیں بنتا ہے۔

تاریکی میں زندہ رہنا ہم کو نہیں منظور
جگنو سا تابندہ رہنا ہم کو نہیں منظور
عالم خورشید

جینے کے لیے سارے ساز و سامان چاہئیں۔ جگنو کی طرح جلنے بجھنے والی زندگی ہمیں نہیں چاہیئے۔ ایسی روشنی اور تاریکی کو دور سے ہی سلام کرتے ہیں۔

غریبی جھانکتی ہے تہ بہ تہ پیوند سے باہر
مگر ہم جیب پر احسان کا بخیہ نہیں رکھتے
خورشید اکبر

ہمارے حال پر کسی کے احسان کی ضرورت نہیں ہے۔ غریبی ہے مگر خودداری کی دولت نہیں کھوئی ہے

نہ جانے کون سی ہے نسل ان پرندوں کی
اکیلے اڑتے نہیں گھونسلوں میں رہتے ہیں

ملک زادہ جاوید

انسان سے زیادہ محبت کا سبق پرندے پیش کرتے ہیں اور آپس میں گھل مل کر اتحاد کا ثبوت دیتے ہیں۔

نسب یہ ہے کہ وہ دشمن کو کم نسب نہ کہے
عجب یہ ہے کہ زمانہ اُسے عجب نہ کہے

شہپر رسول

کسی پر کم نسبی کا الزام لگانا عالی نسبی کی دلیل نہیں، کم ظرفی کی دلیل ہے۔ انوکھا پن یہ ہے انسان بن کر انسانیت کا کام کرے۔ بھیس بدل کر عوام کو گمراہ کرنا ڈھونگیوں کا کام ہے۔

اپنی ترقیوں کی اڑانیں نہ پوچھیے
گھر تنگ ہو گیے کوئی آنگن نہیں رہا

سرور ساجد

ترقیوں کی اڑانوں میں تہذیبی گراوٹ آئی ہے۔ ''آنگن'' جو گھر کا کھلا حصہ ہے صاف و شفاف روشنی اور ہوا فراہم کرتا ہے وہ بھی ختم ہو گیا۔ گھر کی تنگی سے گھٹن محسوس ہونے لگی ہے۔

پہلے یوں لگتا تھا جیسے جل رہی ہے میری رُوح
اب تو عادت بن گئی جلتے ہوئے گھر دیکھنا

مہدی پرتاپ گڈھی

قتل وغارت گری اور فسادات کے مناظر اب عام ہو گئے ہیں ۔ یہ رُوح فرسا منظر اب آنکھوں کے لیے نیا نہیں ہے۔

دھوپ کا سیلاب مٹی کی نمی لے جائے گا
چہرہ چہرہ موسموں کی تازگی لے جائے گا

نسیم پرواز

قتل وغارت گری اور فسادات سے پیدا شدہ حالات کی کربنا کی عجیب تصویر دکھاتی ہے۔ جس سے زندگی کی چمک دمک بجھ جاتی ہے:

تم ستاروں کی حسیں راہ گذر دیکھتے ہو
لوٹ کر آ بھی گئے چاند پہ جانے والے

اشہد کریم الفت

سوچنے والے سوچتے رہ جاتے ہیں، کام کرنے والے کام کر کے گذر جاتے ہیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا زمانہ نہیں رہا۔

وہ جلتے پنکھ لیے بڑھ رہا تھا میری طرف
مری رگوں میں ٹھٹھرتا ہوا دسمبر تھا

رمیش کنول

بے حسی کا جمود ٹوٹتا ہوا اور سرد مہری وقت کے الاؤ سے پگھلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔

اُٹھا کر سر کبھی چلنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی
سیاسی آدمی میں ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی

شکیل جمالی

سیاست خودغرض اور موقع شناس ہوتی ہے۔اس لئے سیاسی آدمی دل کی بات زباں پر نہیں لاتا ہے۔حق بات کہنے سے گریز کرتا ہے اور کتراتا ہے۔

پھول،خوشبو،رنگ،تتلی،پیڑ،پھل
معتبر سب کچھ اسی مٹی سے ہے

سلیم انصاری

مٹی جو صبر وحلم اور عجز وانکساری کی مثال ہے، جسے لوگ بہت حقیر سمجھتے ہیں مگر یہی مٹی بہت کارآمد شئے ہے۔جس سے دنیا کو طرح طرح کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

کھیتوں میں اینٹ بونے کا دستور چل پڑا
اب چھوٹے موٹے گاؤں بھی بازار ہو گئے

شکیل اعظمی

صنعت وتجارت گاؤں تک پہنچ چکی ہے۔اینٹ بھٹوں کا کاروبار گاؤں میں بڑا منفعت بخش ہو چکا ہے۔تعمیری کام کاج نیا موڑ لے چکا ہے۔کھیتوں میں فصلوں سے زیادہ اینٹ بھٹوں میں فائدہ ہے۔جس میں فائدہ ہو وہی کام کرنا چاہئے۔

بڑے ہی شوق سے اک آشیاں بنایا تھا
میں کیسے دیکھوں اسے ٹوٹتے بکھرتے ہوئے

راشد انور راشد

آرزوؤں کے خواب سجانے آسان ہیں مگر انھیں ٹوٹتے بکھرتے ہوئے دیکھنا بڑا مشکل ہے۔محنت رائگاں ہوتے ہوئے بربادی کے نقش بڑے عجیب ہوتے ہیں۔

مری ماں شہر آنا چاہتی ہے
میں اس کا دل دکھانا چاہتا ہوں

خالد عبادی

رشتوں کی پامالی وقت کی مجبوری ہے۔انسان اپنے آپ الگ تھلگ ہو کر روایت سے کٹ کر

جینا چاہتا ہے۔ پرانے لوگ اس نئی طرز زندگی کو قبول نہیں کر پائیں گے۔ ماں کا دل دکھانا بچوں کی فطرت ہے مگر یہاں مجبوری ہے جو ایک نیا منظر پیش کرتی ہے۔

تو جو آتی ہے تو بے چین سا ہو جاتا ہوں
اے مرے گاؤں کی خوشبو تو ادھر مت آنا

عطا عابدی

شہروں میں گاؤں کا خیال بہت ستاتا ہے مگر مسائل زندگی گاؤں میں حل نہیں ہو پاتے ہیں جس کے لیے شہر کی الجھن بھری زندگی کو اپنانا پڑتا ہے۔ اور گاؤں کی سادگی وشائستگی سے دور ہونا پڑتا ہے:

رقص غربت دیکھنا چاہو اگر
بھیڑ میں سکّے لٹا کر دیکھنا

مشتاق صدف

دولہے پر سکّے لٹانے کی رسم کہیں کہیں ہوتی ہے یا کبھی کبھی ارتھی پر بھی سکّے لٹائے جاتے ہیں جس کے پانے کے لیے خطِ افلاس سے گرے ہوئے انسانوں میں رقص کا سماں ہو جاتا ہے اور اس سے ایک المیہ تصور ابھرتی ہے۔

اُس نے آواز دی اور میں نے پلٹ کر دیکھا
آج کل اتنی ملاقات بہت ہوتی ہے

رسول ساقی

تیز رفتار زمانے میں بات کرنے کی بھی مہلت نہیں ہے اس لئے اشارے کنائے سے ہی خیریت پوچھ لیا کرتے ہیں، یہی بہت ہے۔

بچّوں کو مرے شوق ہے تتلی کے پروں کا
اور شہر میں پھولوں کی نمائش نہیں ہوتی

نعمان شوق

شہر میں بچپن نہیں ملتا ہے۔ بچپن مسائل زندگی میں کھو جاتا ہے۔ 5kg وزن کا بدن 5kg کے بستوں کے بوجھ تلے دب جاتا ہے گاؤں کی طرح آزادانہ ماحول شہر میں نہیں ملتا ہے۔

یہ جسم کیوں، یہ روح کیوں، حیات کیوں، ریاض کیوں
صفر صفر کی گونج ہے تلاش کے مزار میں

ریاض لطیف

صفر کی اہمیت بہت عجیب ہے۔ جس کے ساتھ ملتا ہے اُسے دس گنا بڑھا دیتا ہے مگر اپنی طاقت کبھی نہیں بتاتا ہے۔ علم ریاض میں صفر کا ایک انوکھا مقام ہے۔ صفر تلاش و جستجو کی دعوت دیتا ہے مگر تمام تلاش و جستجو کے بعد بھی صفر صفر ہی رہتا ہے صفر کا بھید خدا کی ذات کی طرح عیاں بھی ہے اور روپوش بھی ہے۔

تری طلب پہ تو حیران آسماں ہے رئیس
کہ تو نے چاند نہیں اس کا داغ مانگا ہے

رئیس الدین رئیس

اچھی چیز کے سارے لوگ طلب گار ہوتے ہیں، بُرے کا کوئی نہیں۔ روشنی میں سب ساتھ دیتے ہیں اندھیروں میں کوئی نہیں مگر اندھیروں میں ساتھ دینے کی طلب یا کسی خوبصورت چیز سے اُس کی وہ بدصورتی جو اس کی خوبصورتی کو داغدار کرتی ہے اُس سے مانگ کر اسے اور خوبصورت بنانے کی طلب ایک انوکھی بات ہے۔

ان اشعار میں فنی، فکری اور لسانی تبدیلیاں واضح طور پر نمایاں ہیں۔ اور یہ اشعار ہمیں روایتی غزلوں سے الگ ایک نئی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔ جس سے غزل کا نیا رنگ و آہنگ ملتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد غزل گو کے ایک ایک شعر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر بھی کئی اہم نام چھوٹ گیے ہیں۔ ہمارا مقصد فہرست سازی نہیں ہے بلکہ نئی غزل کی ایک جھلک پیش کرنا ہے۔ جس سے جدید غزل کا روایت سے بدلتا ہوا چہرہ سامنے آجائے اور اس کی نئی تصویر کا خاکہ دل و دماغ میں اُتر جائے۔

آزادی کے بعد غزل گوئی اپنے بام عروج کی طرف گامزن نظر آتی ہے۔ فکر و فن کے نئے نئے چراغ جلتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی روشنی سے زندگی کے ہر گوشے پر نور اور تابندہ ہوئے جاتے ہیں۔ حالی اور کلیم الدین احمد کے مطالبات کو غزل پوری کرتی ہوئی ملتی ہے۔ آج میر، غالب، اقبال جیسا غزل گو تو نہیں ملتا ہے مگر آج کی غزلیں گذشتہ تمام عہد سے زیادہ زندگی کے حسن و جمال سے لے کر حزن و ملال کی نمائندگی کرتی ہیں ۔جدید غزل گو شعرا کی بہت لمبی فہرست ہے، ظاہر ہے۔ ان سبھی کے فکر و فن پر بات کر نے کے لئے کافی دشواریاں در پیش ہیں اس لیے میں نے ان میں سے چند شعرا کرام کو اپنے موضوع کے لئے منتخب کیا ہے اور انھیں دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ایک کا تعلق ۱۹۸۰ کے پہلے کا ہے، جن کی شاعری اپنے آخری ادوار میں گامزن ہے یا ختم ہو چکی ہے۔ یہ شعرا کرام زندگی کے آخری پڑاؤ پر سفر کر رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کا خورشید حیات غروب بھی ہو چکا ہے۔ دوسری نسل ۱۹۸۰ کے بعد کی ہے جن میں کچھ نے اپنی پہچان بنالی ہے اور کچھ بنانے والے ہیں۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ہماری فہرست کے تمام شاعروں کا تعلق بہار اور جھارکھنڈ سے ہے۔ مگر ان کی شاعری کا دائرہ صرف بہار اور جھارکھنڈ تک محدود نہیں ہے بلکہ دور تک دکھائی دیتا ہے۔ اس میں چند نام تو تمام سرحدیں پار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ان کے فن کے ڈنکے عالمی سطح پر بجتے ہیں۔

☆

حسن نعیم

نام: سید شاہ حسن نعیم

ولدیت: سید محمد نعیم

تاریخ پیدائش: ۱۹۲۸ء

تعلیم: بی۔ایس۔سی

وطن: شیخ پورہ، بہار

پتہ: رحلت فرما گئے۔

پیشہ: سرکاری ملازمت

تصانیف: ۱۔اشعار

۲۔غزل نامہ (ہندی)

۳۔دبستان

حسن نعیم

جدید ترین اردو غزل کا پہلا ماڈرن آرٹ شاعر حسن نعیم ہے جس نے اپنے خون جگر سے غزل گوئی کو ایسی توانائی و تازگی عطا فرمائی کہ فکر و احساس اور دانش و آگہی کے بیک وقت ہزاروں چراغ روشن ہو گئے۔ اسلوب و بیاں کے نئے لب و لہجے نے ''ظرف تنگنائے غزل'' کی روایت توڑ کر غم حیات کو غم کائنات کی وسعتیں عطا فرمادیں یا غم کائنات کو غم حیات کے دامن میں سمیٹ لیا۔ ان کی غزلوں میں فکر و فن کی ایسی سحر کاری اور پختگی موجود ہے جس کے لئے غالب جیسا عہد ساز شاعر بھی تمنا کرتا ہے اور مومن کے اِک شعر پر اپنا دیوان نچھاور کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ غزل کی دیوی فن کا یہ وردان کسی کسی کو عطا کرتی ہے۔ میں اپنے دعوے کی دلیل کے لئے چند اشعار پیش کر رہا ہوں، ملاحظہ فرمائیں:

وہ میرے شعر کی مانند کج کلاہ سہی
نظر ملاؤ تو اپنا دکھائی دیتا ہے

اب خدا جانے تجھے بھی ہے تعلق کہ نہیں
لوگ لیتے ہیں مرا نام، ترے نام کے بعد

ایک طوفاں زیر پا تو اِک قیامت سر پہ ہے
ہم نے کس آندھی کو بویا سچ کو سچ کہتے ہوئے

اپنی صفوں میں علم ہے جرأت ہے وقت ہے
ایسا نہیں کہ سچ کا مقدر شکست ہے

دیکھا نہیں ہو جس نے ترے دل کا آئینہ
کیا قیمت نگاہ شبِ رونمائی دے

میں نہ طوفان سے جھکا ہوں اور نہ آندھی سے دبا
ان درختوں سے تو اونچا ہوں بلا سے گھاس ہوں

نہ جانے ایسے کتنے اشعار حسن نعیم کے زندہ جاوید ہیں جن میں فکرو آگہی کی ایسی پختگی موجود ہے جنہیں صدیوں کی گرد بھی نہیں دھندلا سکے گی اور ان کی تابندگی زندہ و پائندہ رہے گی۔ حسن نعیم کی زندگی اور ان کے فکروفن میں بہت حد تک غالب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ میں چند اشعار اور زندگی کے وہ رُخ جو غالب سے ملتے جلتے ہیں ان پر روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

۱۔ غالب نے تمام عمر قلندرانہ زندگی گزاری
حسن نعیم کی زندگی کے آخری ایام بھی اسی انداز کے گزرے

۲۔ غالب نے مغنیہ سے عشق کیا
حسن نعیم نے بھی مغنیہ سے عشق کیا اور اس کے ساتھ رہے آخری سانس بھی اس کے پہلو میں لیا۔

۳۔ غالب نے مے نوشی میں زندگی گزاری
حسن نعیم نے بھی زندگی کو نذر جام کیا

۴۔ غالب کے فن کی قدر و قیمت ان کے جیتے جی نہیں ہوئی۔
حسن نعیم کے فن کی بھی قدر و قیمت جیتے جی نہیں ہوئی۔

۵۔ غالب انا پرست تھے۔
حسن نعیم بھی انا پرست رہے۔

۶۔ غالب کو زمانے سے شکایت تھی۔
حسن نعیم کو بھی زمانے سے شکایت رہی۔

۷۔ غالب کے اشعار میں تازگی و تہہ داری ہے
حسن نعیم کے بھی اشعار تازگی و تہہ داری سے بھرپور ہیں۔

۸۔ غالب بہت کم غزلیں لکھ کر شہرت کی پروان چڑھے۔
حسن نعیم نے بھی بہت کم غزلیں لکھ کر شہرت کی بلندی طے کی۔

غالب اور حسن نعیم کی مماثلت اشعار کے آئینے میں:

ایک بھی حرف نہ تھا خوش خبری کا لکھا
نامہ وقت ملا اور کسی کا لکھا
حسن نعیم

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا
غالب

شائد کہ مثل مہر کوئی آئے صبح دم
شامِ فراق تم بھی جگر کو لہو کرو
حسن نعیم

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے
غالب

جاگیر اپنی بانٹ کے درویش بن گیا
بس شوق تھا کہ دیکھ لوں دنیا کا اصل روپ
حسن نعیم

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں
غالب

مجھ سے مت بھولیو وفا کرنا
روح کب سے وفا کی پیاسی ہے
حسن نعیم

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
غالب

دل وہ کشت آرزو تھا جس کی پیمائش نہ کی
سیر دنیا کے سوا ہم نے کوئی خواہش نہ کی
حسن نعیم

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مِرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
غالب

پاؤں سے لگ کے کھڑی ہے یہ غریب الوطنی
اس کو سمجھاؤ کہ ہم اپنے وطن آئے ہیں
حسن نعیم

اے پرتو خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
غالب

آرزو ممکن ہے شرحِ آرزو ممکن نہیں
ان سے اب تک والہانہ گفتگو ممکن نہیں
حسن نعیم

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
غالب

درج بالا اشعار اور حالاتِ زندگی سے غالب اور حسن نعیم کی مماثلت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے زندگی کو ایک مرد قلندر کی طرح گزارا ہے اور اس کا اعتراف بھی یہ غالب کی طرح انا پرستی کے ساتھ کرتے ہیں۔

یاروں کو ہر طرح کا تحفظ عزیز تھا
ہم نے چنی وہ راہ جو مردوں کی راہ تھی

حسن نعیم کے اشعار معنویت کی گہرائی و گیرائی سے بھرے پڑے ہیں اور ان میں زبان و بیان کی ایسی چاشنی اور شیرینی موجود ہے کہ قاری کو یہ کہتے ہوئے داد دینی پڑتی ہے

ع جہانگیری کرے گی یہ ادا نورِ جہاں ہو کر

حسن نعیم کے اشعار مشہور و معروف غزل گو شعراء کرام کے اشعار کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھتے ہیں جن سے ان کے فن کی عظمت کا پتا چلتا ہے

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار
تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا
میر تقی میرؔ

ہر لمحہ اضطراب ہے ہر لحظہ انتشار
دل کا وہی ہے حال جو دینا کا حال ہے
حسن نعیم

میرؔ نے غم حیات کو کائنات بنا کر پیش کیا ہے۔ حسن نعیم نے غمِ کائنات کو غمِ حیات بنا لیا ہے۔ میرؔ نے قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار سے غمِ حیات کا نقشہ کھینچا ہے۔ حسن نعیم نے ہر لمحہ اضطراب، ہر لحظہ انتشار سے غمِ کائنات کی تصویر اُتاری ہے ''تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا'' کہہ کر میرؔ نے اپنے حال پر حیرت ظاہر کی ہے۔ حسن نعیم نے ''دل کا وہی ہے حال جو دنیا کا حال ہے'' کہہ کر دنیا کے حال پر حیرت ظاہر کی ہے۔ حسن نعیم کا شعر کہیں بھی میرؔ سے کم نظر نہیں آتا ہے۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
غالبؔ

کتنے اشکوں کے دیئے جلتے رہے بجھتے رہے
یوں بظاہر چین سے میں رات بھر سوتا رہا
حسن نعیم

یہ شعر غالب کا شہرہ آفاق شعر ہے۔ سہل ممتنع اور زبان و بیان کے لطف سے بھرپور ہے۔ معنویت اور جامعیت بھی ہے۔ موت و زندگی کا حقیقی فلسفہ بھی ہے۔ حسن نعیم کا شعر بھی زندگی کی حقیقت کا عکاس ہے، سادگی و پرکاری کی بھرپور آمیزش ہے اور غالب کی طرح اضطرابی کیفیت و پریشان کن حالات کی نمائندگی کرتا ہے۔

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اُبھرنے لگتے ہیں
فیض

کہرے میں آفتاب کہ مایوسیوں میں آس
جینے کی ہو سبیل تو سب کچھ دکھائی دے
حسن نعیم

فیض نے جس اُمید کی شمع روشن کی ہے اور زندگی کا جو جواز ڈھونڈا ہے اس سے حسن نعیم کہیں بھی کم تر دکھائی نہیں دیتے ہیں جس طرح فیض درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتے ہی ستارے اُبھار لیتے ہیں، اسی طرح حسن نعیم جینے کی سبیل میں کہرے سے آفتاب نکال لیتے ہیں اور اندھیرے میں ستاروں کے اُبھرنے سے زیادہ کہرے سے آفتاب میں زندگی کی رمق دکھائی دیتی ہے۔

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
فراق

میں نے مانا کہ مجھے ان سے محبت نہ رہی
ہم نشیں! پھر بھی ملاقات سے جی ڈرتا ہے
حسن نعیم

فراق نے جہاں ''ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں'' کہہ کر یاد کرنے کا انوکھا ثبوت دیا ہے حسن نعیم نے بھی ''میں نے مانا کہ مجھے ان سے محبت نہ رہی'' کہہ کر محبت کرنے کا نرالا طرز بیان اپنایا ہے اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے جیسے فراق نے دوسرے مصرع میں ''اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں'' کہہ کر کیا ہے۔ حسن نعیم نے بھی ''ہم نشیں! پھر بھی ملاقات سے جی ڈرتا ہے'' کہہ کر کام مکمل کر دیا ہے۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے
ناصر کاظمی

مرے شعروں میں بس گئی آخر
اُس کی آنکھوں میں جو اداسی ہے
حسن نعیم

ناصر کاظمی نے جس سلاست و سادگی کے ساتھ اداسی کی تصویر اُتاری ہے اور اُسے کھلے بال کے ساتھ اپنے گھر کی دیواروں پر سلایا ہے۔ حسن نعیم نے بھی اسی اداسی کو فنی بصیرت کے ساتھ اپنے محبوب کی آنکھوں سے لے جا کر اپنے شعروں میں بسایا ہے:

کچھ نہ کچھ تو ساتھ اپنے یہ سفر لے جائے گا
پاؤں میں زنجیر ڈالوں گا تو سر لے جائے گا
بانی

پے بہ پے تلوار چلتی ہے یہاں آفات کی
دست و بازو کی خبر لوں تو سمجھئے سر گیا
حسن نعیم

بانی نے زنجیر پا ہونے میں سر کے جانے کا خدشہ ظاہر کیا ہے تو حسن نعیم نے دست و

بازو کی خبر گیری میں سر کے جانے کا اظہار کیا ہے۔

کرتے ہیں یاد اب تک بیتی ہوئی بہاریں
آنکھوں سے چومتے ہیں اک ایک پنکھڑی کو
خلیل الرحمٰن اعظمی

گفتگو تجھ سے کریں گی میری غزلیں صبح و شام
تیری خلوت میں مری تنہائیاں رہ جائیں گی
حسن نعیم

خلیل الرحمٰن اعظمی گزرے ہوئے وقت کو آنکھوں سے لگاتے ہیں جوان کا محبوب ہے اور اک ایک پنکھڑی کو چومتے پھرتے ہیں تو حسن نعیم بھی اسی وقت کو جوان کا محبوب ہے اپنی غزلیں دے کر یادوں کے نقش چھوڑ دیتے ہیں جو صبح و شام اس سے گفت وشنید کرتی رہتی ہیں۔

حسن نعیم کی غزلوں میں فکر و فن کی ایسی تپش موجود ہے جس کی گرماہٹ قاری اپنے وجود میں محسوس کرتا ہے اور اس کے تاثر دل و دماغ پر اُبھرتے ہیں خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کی غزل گوئی کے متعلق یوں فرمایا ہے۔

''ان کی شاعری بھی سرسری مطالعے کی چیز نہیں ہے یہ اپنے پڑھنے والے سے بار بار توجہ کا تقاضا کرتی ہے تب اس کی تہیں کھلتی ہیں۔ وہ اپنی چھوٹی غزلوں میں کوئی نہ کوئی بچھو چھپا کر رکھ دیتے ہیں جو ہم جیسے حساس قاری کو ڈنک مارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بہ ظاہر سادہ شعر میں بہت گہری بات کہہ جاتے ہیں۔''

(مضامین نو صفحہ ۱۰۔۲۰۷)

حسن نعیم کے سلسلے میں کچھ ادباؤ شعراء کرام کی آراء شامل کر لیتے ہیں جس سے ان کی شاعری کے کچھ اور باب کھل جاتے ہیں:

کالی داس گپتارضا:۔

''اب غزل مختصر کہی جانے لگی ہے یعنی پہلے کی طرح بیس تیس شعر کی غزل اب تقریباً نا پید ہے الفاظ کے الٹ پھیر سے اور محض محاوروں و روزمرہ کے بل پر اب کام نہیں چلتا۔ فکر و فن، جذبے کی سحر کاری اور جوہر شاعری سے اگر شعر مزین نہیں تو آج اسے شعر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ حسن نعیم مرحوم کی غزل میں مؤخر الذکر تمام صفات موجود تھیں۔'' (بحوالہ کلام دبستاں حسن نعیم)

پرفیسر محمد حسن:۔

''دور جدید کی ہندوستانی غزل میں میرے نزدیک دو آوازیں خصوصیت سے توجہ طلب ہیں ایک حسن نعیم دوسرے شجاع خاور۔ حسن نعیم کی غزل میں ایک انوکھا کس بل ہے''

(غزل کا تخلیقی سفر بحوالہ معاصر اردو غزل مرتبہ قمر رئیس ص ۲۱)

مخمور جالندھری:۔

''نعیم کی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک بات قاری کو چونکا دیتی ہے کہ اس کی ابتداء میں بھی حیرت ناک دل نشینی ہے اور پختگی موجود رہتی ہے۔ وہ فکر و احساس اور دانش و آگہی کا شاعر ہے۔''

(حسن نعیم جمال فکر آہنگ گیا مارچ ۱۹۷۵ء)

پروفیسر قمر رئیس

''حسن نعیم کے شعروں میں لفظوں کی سجاوٹ سے پیدا ہونے والے فطری حسن کی ایک خاص اہمیت ہے لہٰذا ان کے ہر شعر میں کچھ لفظ اور لفظوں کے مجموعے معنی کے لیے عکس قائم کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں انجام کاران کا علامتی عمل سیدھے طور پر پرت در پرت گزرتا ہوا معنی کے نئے زاویے سے قاری کو روشناس کراتا ہے۔ ان کے شعروں میں لفظوں یہاں تک کہ ردیف اور قافیے کا استعمال بھی یک رخی بندھا ٹکا اور منشی نہیں ہوکر کثیر رُخی اور حرکی ہوتا ہے۔ اور یہ خاصیت ہے جو نئی غزل میں ان کی انفرادی شناخت قائم کرتی ہے۔''

(ترجمہ ہندی ایڈیشن غزل نامہ ص ۷۸)

پروفیسر سید محمد عقیل:

''ان (حسن نعیم) کے مجموعہ ''اشعار'' میں ایسی کیفیت ملتی ہے جس میں ان کی دنیا کھوئی ہوئی معلوم پڑتی ہے.......... ہر شاعر یا ادیب قدر کا بھوکا ہوتا ہے حسن نعیم کو وہ قدر و منزلت نصیب نہ ہوئی جس کے وہ حقدار تھے۔''

(حسن نعیم کے سانحہ ارتحال پر انجمن اردوئے معلا شعبۂ اردو مسلم یونیورسیٹی علی گڑھ ۳ مارچ ۱۹۹۱)

ندا فاضلی:

''حسن نعیم محفل میں غزل سنا رہے ہیں غزل کا ہر مصرع ہونٹوں سے باہر آنے سے پہلے اعلان کرتا ہے پہلا خدائے غزل میر تقی

میر دوسرا بابائے غزل مرزا غالب تیسرا دادائے غزل حسن نعیم۔"

(دیواروں کے بیچ حصہ اول: ۸۷)

اور بھی بہت سارے ادباؤ شعراء کرام حسن نعیم کی شعری عظمت کا احترام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں آخر ان کی شاعری میں ایسی کون سی بات ہے یا فن کا کون سا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے آیئے اُسے تلاشنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سر پہ رکھ دیتا وہ اک تاج تو مارے جاتے
کم نہیں اس کا کرم خاک بہ سر رہنے دیا

قلندرانہ صفات، درویشانہ طرز عمل، فقیرانہ شان کی اس سے اچھی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔ شعر نے فکر و معنی کے آفاق کی وسعت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔

خوش نصیبی سے ہوا ہوں وارث سوزِ حسین
ورنہ ماتم کے لیے اِک کربلا کس میں نہیں

پرانی بوتل میں نئی شراب بھر کر پیش کیا ہے اپنے دکھ درد کو واقعات کربلا سے جوڑ کر کتنا خوبصورت خیال پیدا کیا ہے اور غم حسین کی خون آلود کربنا کیوں کی وراثت کا فخر جتایا ہے۔

میں اس درخت سے کمتر ہوں مرتبے میں حسن
جو دھوپ سہہ کے مسافر کو پیار دیتا ہے

عجز و انکسار کی بڑی خوبصورت دلیل ہے خاکساری میں حقیقت کا رس گھول دیا ہے۔

موجۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوک قلم
وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا

فیض نے کہا ہے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں ہم نے

فیض کے اس خیال سے الگ کتنا خوبصورت خیال پیدا کیا ہے۔ انا پرستی کی اور صبر و تحمل کی داد دینی پڑتی ہے۔

حسن نعیم کے کئی اشعار معنویت و جامعیت سے بھرے پڑے ہیں۔ بیان کو طول دینا مقصد نہیں ہے۔ اخیر میں یہ کہتے ہوئے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ حسن نعیم کے فکر و فن پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے جس سے ان کی غزل گوئی کو جائز مقام حاصل ہو جائے تا کہ ان کی روح غالب کی طرح پر سکون رہے اور ان کے اس شعر کو حقیقت کا پیراہن مل جائے۔

میں نکل جاؤں گا اپنی جستجو میں ایک دن
بزمِ یاراں میں خیال آرائیاں رہ جائیں گی

مظہرامام

نام: مظہرامام

ولدیت: سیدامیرعلی

تاریخ پیدائش: ۵/مارچ ۱۹۳۰ء

تعلیم: ایم۔اے۔

وطن: دربھنگہ

پتہ: ۱۷۶۔بی، پاکٹ ا،میوروہار، فیز۔ا،دہلی ۱۱۰۰۹۱

پیشہ: ڈائرکٹر کشمیر دوردرشن (سبکدوش)

تصانیف: شعر: زخم تمنا (نظمیں،غزلیں ۶۲ء)، رشتہ گونگے سفر کا (نظمیں،غزلیں ۷۴ء)
۳.پچھلے موسم کا پھول (غزلیں)،۴.بند ہوتا ہوا بازار (نظمیں ۹۲ء)
نثر: ۵.آتی جاتی لہریں (تنقیدی مضامین ۸۱ء)۶.آزادغزل کا منفرد منظرنامہ (تحقیقی اشاریہ ۸۸ء)، ۷.جمیل مظہری (مونوگراف ۹۲ء)
۸.اکثر یاد آتے ہیں (یادداشتیں ۹۳ء)، ۹.ایک لہر آتی ہوئی (تنقیدی مضامین) ۱۹۹۷ء

مظہر امام

جدید غزل گو شعرا کی فہرست میں مظہر امام کا نام دور سے ہی جانا پہچانا جاتا ہے کیونکہ ان کی غزلوں میں فنی بصیرت کے ساتھ ساتھ فکر کی پختگی، خیالات کی روانی، احساس کی تروتازگی، جذبات کی ترجمانی، الفاظ کی شگفتگی و شائستگی اور روایت کی پاسداری اتنے خوش آہنگ اسلوب میں گھل کر ملتی ہے کہ اس کی شیرینی دل و دماغ میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اُس کا نشہ ایک کیف آور سرور بخشتا جاتا ہے۔

ہوا تھی، رنگ تھی، خوشبو تھی، خواب فردا تھی
وہ زندگی نہ سہی، زندگی کا حصہ تھی

تو ہے گر مجھ سے خفا، خود سے خفا ہوں میں بھی
مجھ کو پہچان! کہ تیری ہی ادا ہوں میں بھی

تم ہوا ہو تو بکھیرو مجھے ساحل ساحل
موج مئے ہو تو بہا دو مجھے دریا کی طرح

زندگی بھول گئی اپنا پتہ لوٹ چلیں
جس کو آنا تھا وہ آنے سے رہا، لوٹ چلیں
پرسکون گھر میں بھی کیا وہی ہے ہنگامہ
اس طرف سے جب گذروں، بند کھڑکیاں دیکھوں

ان اشعار میں فکر و احساس کی جو جاذبیت اور شیرینی ملتی ہے اُس سے مظہر امام کے فکر و فن کی پختگی یا فنی شعور کا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ انھوں نے شعور کی رو میں تجربات واحساسات کو خیالات کے حسین شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے اور اسے اسلوب کا خوش رنگ لبادہ دے کر معنویت کی رُوح بھی بخش دی ہے۔ ان کے فکر و خیال اسلوب کی شیرینی اور زیور معانی سے آراستہ و پیراستہ رہتے ہیں۔ ان کی غزلیں تہذیب و تمدن کے روایتی رنگ و روغن سے بجی سنوری ہوئی ایک نئے تر و تازگی کے ساتھ ملتی ہیں۔ ان میں کلاسیکی رچاؤ بھی ہے اور عصری حسیت بھی ہے۔ ان کی شاعری پر جگن ناتھ آزاد نے یوں فرمایا ہے۔

"مظہر امام کا شمار ہمارے ملک کے ان شعرا میں ہے جن کا کلام غزل ہے یا نظم خالص تغزل میں رچا ہوا ہے۔ میں نے یہاں تغزل کا لفظ جان بوجھ کر غزل کے عام مفہوم سے ہٹ کر استعمال کیا ہے۔ اس لیے کہ آج اکثر و بیشتر ایسی غزلیں پڑھنے میں آرہی ہیں جن میں سوائے تغزل کے سب کچھ ہے۔ ان میں مسائل ذات بھی ہیں اور مسائل حیات بھی، فکر بھی ہے اور سیاست بھی لیکن اگر نہیں ہے تو تغزل کی وہ کیفیت جس کا ہونا اشد ضروری ہے۔"

(رابطہ جنوری تا جون ۹۱ (مظہر امام نمبر صفحہ ۸۶)

شاعری کے لیے تغزل کی وہی اہمیت ہے جو دلہن کے لئے بناؤ سنگھار کی ہے۔ جس طرح بغیر سج دھج اور بناؤ سنگھار کے دلہن اچھی نہیں لگتی ہے اسی طرح شاعری بھی بغیر تغزل کے اچھی نہیں لگتی ہے۔ نظم کے لئے تو کسی حد تک کام چل بھی سکتا ہے غزل تو بغیر تغزل کے ادھوری ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی دوررس نگاہ ان کے شعری تغزل کو پہچان لیتی ہے اور یہی انفرادیت انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ ان کی غزلیں زندگی کے کیف و سرمستی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اشعار سے نشاط آمیز حزن والم کے جھرنے پھوٹتے رہتے

ہیں۔ تمثیل کے لئے چند اشعار پیش ہیں۔

"خواب، خوشبوئے طلب، رنگ ہوس، ناز ووفا
سارا سرمایہ گیا، چلئے یہاں سے چلئے

مرے سب خواب تاروں کی طرح ٹوٹے مگر اس کا
گلوں کی اوس میں بھیگا ہوا پیکر نہیں بدلا
آیا تھا وہ بہار کا موسم گزارنے
اپنے لہو میں اپنا سراپا بھگو گیا

اس نے اس طرح اُتاری مرے غم کی تصویر
رنگ محفوظ تو رہ جائیں پہ منظر نہ رہے

شب کی دہلیز پہ چمکی نہ کسی پاؤں کی چاپ
روزنِ صبح بھی کھولے نہ کھلا، لوٹ چلیں

ان اشعار میں کیف ونشاط کے سرور بھی ملتے ہیں اور حزن والم کی لذت دار چبھن بھی ملتی ہے۔ پہلے شعر کے پہلے مصرع میں "خواب، خوشبوئے طلب رنگِ ہوس، ناز ووفا" سے اظہار تاسف کی چبھن محسوس ہوتی ہے اور "چلئے یہاں سے چلئے" کا ٹکڑا غم کا اظہار کرتا ہے۔ زندگی کی ناراضگی ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے شعر میں خواب کا تاروں کی طرح ٹوٹنا اور گلوں کی اوس میں بھیگا ہوا پیکر کا نہ بدلنا حیرت واستعجاب کا بڑا لطیف پیرایۂ اظہار ہے۔ جس سے شبنمی اداسیوں کی جھلک ملتی ہے۔ تیسرے شعر میں پہلا مصرع "آیا تھا وہ بہار کا موسم گزارنے "سرور وکیف لئے حیرت بھرا لہجہ ہے جبکہ دوسرا مصرع "اپنے لہو میں اپنا سراپا بھگو گیا" دکھ

درد کی تصویر بن کر نشاط وکیف کے تجسس کو غم و اندوہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ چوتھے شعر میں تصویر غم اتارنے میں مصور غم سے حیرت کا اظہار ہے۔ یہ کیسی تصویر ہے جس میں رنگ تو محفوظ ہے مگر منظر غایب ہے جبکہ تصویر کے لئے منظر پہلی شرط ہے، رنگ و روغن دوسری۔ پانچویں شعر میں ''شب کی دہلیز'' پہ ''پاؤں کی چاپ'' کی ''چمک'' کی امید سے ایک نشاطیہ تجسس ابھرتا ہے اور جب ''روزن صبح'' کھولے نہیں کھلتا ہے تو یہ اُمید مایوسیوں میں ڈوب جاتی ہے۔ پھر ''لوٹ چلیں'' کا ٹکڑا کفِ افسوس ملنے لگتا ہے۔

مظہر امام کی شاعری میں کیف ونشاط اور حزن و ملال گھل مل کر سامنے آتے ہیں۔ جس سے رنج وغم اور مسرت وشادمانی کی انوکھی تصویر ابھرتی ہے اور پھر یہ تصویر حیرت واستعجاب کے رنگوں میں ڈوب جاتی ہے۔

مظہر امام کشمیر ٹیلی ویژن مرکز سے وابستہ رہے اس لئے وہاں کی سرور وکیف میں ڈوبی ہوئی شادابیوں کو دیکھا ہے اور پھر وہاں کی خون آلود الم ناکیوں کو بھی دیکھا ہے، ارض جنت کو جہنم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس لئے ان سب باتوں کا اثر ان کی شاعری میں بہت فنکاری کے ساتھ نظر آتا ہے جس میں اظہار تجسس ایک نئی کیفیت کے ساتھ اُبھرتا ہے

آیا تھا وہ بہار کا موسم گذارنے
اپنے لہو میں اپنا سراپا بھگو گیا

اس شعر میں پہلی نظر میں جو منظر ابھرتا ہے وہ کشمیر کی وادیوں کا منظر ہے مگر اس کے بعد دائرہ پھیلتا جاتا ہے اور یہ دائرہ وادیٔ کشمیر سے دنیا اور دنیا سے بھی آگے پہنچ جاتا ہے۔ کشمیر جو بہت سر سبز وشاداب وادی ہے لوگ وہاں سیر سیاحت کے لئے جاتے ہیں مگر وہاں کا ماحول بم بارود گولیوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ آئے دن خون ریزی ہو رہی ہے۔ زندگی دشوار ترین مراحل سے گذر رہی ہے۔ آدمی کو کس وقت کون سا لمحہ موت کا پیغام سنا جائے پتا نہیں ہے۔ موت تو انسان کو آنی ہے۔ مگر انسان یہاں اپنے ہاتھوں موت کا کھیل کھیل رہا

ہے۔پہلی نظر میں یہ منظر کشمیر کا لگتا ہے مگر غور کرنے پر ساری دنیا کا اس وقت یہی حال نظر آتا ہے وہ افغانستان ،عراق، فلسطین،ایران، پاکستان، امریکہ،لندن، بنگلہ دیش ،کوریا، چین جاپان، کہیں بھی ہو اور پھر جب غور کرتے ہیں تو اس شعر میں ایک اور رُخ نظر آتا ہے ،انسان کو جنت کے بدلے دنیا ملی ہے۔ جنت سبزہ وشاداب باغ و بہار کی جگہ ہے۔اس لئے دنیا میں بھی وہ اسی نظریے کیساتھ آتا ہے۔انسان کی فطرت میں جنت کے عیش وآرام بسے ہوئے ہیں۔مگر یہاں آکر وہ پریشانیوں اور الجھنوں میں ڈوب جاتا ہے۔

ہم نے تو دریچوں پہ سجا رکھے ہیں پردے
باہر ہے قیامت کا جو منظر تو ہمیں کیا

اس شعر میں بھی اسی طرح کی کیفیت ملتی ہے اس کا دائرہ بھی وادیٔ کشمیر سے ہوتا ہوا زماں ومکاں کی حدوں تک پھیل جاتا ہے۔ یہاں بھی پہلی نظر میں کشمیر کا منظر اُبھرتا ہے اور وہاں کے حالات دکھائی دیتے ہیں۔شاہراہوں پر قتل وغارت گری کا بازار گرم ہے۔مگر انسانیت کا دعویٰ کرنے والے سفید پوش اپنے گھروں میں دبکے ہوئے ہیں۔بے حسی کی گرد آنکھوں پر پڑی ہوئی ہے ظلم کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔لیکن یہ حال صرف وادیٔ کشمیر محدود تک نہیں ہے۔افغان کی وادیوں سے لے کر بغداد کی گلیوں تک یہی صورت حال ہے۔ پھر اس خیال سے الگ ہو کر ایک دوسرا خیال اُبھرتا ہے۔ دنیا انسان کے لئے دارالعمل ہے۔مگر انسان یہاں کی بھول بھلیاں میں گم ہے۔وہ ”کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے“ کی ڈگر پر گامزن ہے۔انسان حقیقت کو بھول چکا ہے ۔آنکھوں پر پردہ ڈال رہا ہے۔دنیا کے باہر قیامت کا ہولناک منظر ہے۔دوزخ کی آگ اُبال کھا رہی ہے جسے وہ قصداً بھولا ہوا ہے اور اس کی فکر چھوڑ چکا ہے۔

خواب،خوشبوئے طلب،رنگ ہوس،نازووفا
سارا سرمایہ گیا، چلئے یہاں سے چلئے

یہاں بھی خیالات کے وہی منظر انگڑائیاں لیتے ہیں۔ خواب، خوشبوئے طلب ، رنگ ہوس، ناز و وفا، سے کشمیر کی وادی آواز دیتی ہے اور پھر سارا سرمایہ گیا۔ بم بارود گولیوں کی نذر ہو جاتا ہے چلئے یہاں سے چلئے" کا ٹکڑا بھی اس صورت حال کا کرب بیان کر رہا ہے اور اس شہر کی زندگی سے بے زار ہے۔ یہی حال ساری دنیا کا نظر آتا ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ یوں دکھائی پڑتا ہے۔ خواب، خوشبوئے طلب، رنگ ہوس، ناز و وفا جو سرمایۂ حیات ہے۔ زندگی سے ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے اس دنیا میں رہنا بے کار ہے۔ "چلئے یہاں سے چلئے" کا تجسس برقرار ہے یہ واضح نہیں ہوتا ہے کہ کہاں سے چلئے اس شہر سے چلئے جہاں آرزوؤں کا خون ہوا ہے یا اس دنیا سے چلئے جہاں تمنائیں دم توڑ چکی ہیں۔

مظہر امام نے زمانے کا بڑا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ زندگی کی نفسیات کو سمجھا ہے۔ تجربات کی بھٹی میں جل کر انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ یہ تجربے ان کی زندگی کے بڑے قیمتی تجربے ہیں جنہیں انہوں نے شاعری کا جامہ پہنایا ہے۔ ہم یہاں ان کے ایسے چند اشعار پر روشنی ڈال رہے ہیں جن کے اند تجرباتی فکر و فن کی بے پناہ مقناطیسی صلاحیت موجود ہے۔

کیا پتا تھا ایک دن تصویر بن جائیں گے ہم
خامشی چپکے سے آئے گی صدا لے جائے گی

زمانے کی تیز رفتاری کا کتنا خوبصورت المیہ ہے۔ آج زندگی کتنی مصروف ہے۔ ہر آدمی مشین ہو کر رہ گیا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت گم ہو چکی ہے۔ زندگی کی حرکت ختم ہو چکی ہے۔ زندہ دلی کا ثبوت مٹ چکا ہے۔ سماج کا تصور کھو گیا ہے۔ انسان بالکل اکیلا ہو گیا ہے۔ بے حسی کی بھیڑ میں غم خوشی، رنج راحت، دوستی، دشمنی، بھائی چارگی، نفرت محبت، آنسو مسکراہٹ، رشتے ناطے جن سے زندگی حرکت کرتی ہے یہ سارے الفاظ معانی کھو چکے ہیں۔ زندگی ایک تصویر بن کر بے جان ہو چکی ہے جسمیں رنگ روغن تو ہے مگر حرکت

نہیں ہے۔انسان جیتے جی پتھر کی مورت بن گیا ہے۔

نرم رو تھا تو سبھی راہ سے منہ موڑ گئے
سنگ اُٹھایا تو مرے ساتھ زمانہ نکلا

زمانہ جب سنگدل ہو جائے تو نرم دلی سے کام نہیں چلتا ہے۔نرم دلی اس وقت عذاب بن جاتی ہے۔اپنے پرائے سبھی چھوٹ جاتے ہیں۔اس لئے زمانے کو سدھارنے کے لئے سخت دل بننا پڑتا ہے۔سختی اپنانی پڑتی ہے۔ورنہ انسان اکیلا ہو جاتا ہے۔یہ فطرت کا تقاضہ ہے۔تجربہ یہی کہتا ہے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہئے۔

مجھ کو پانا ہو تو ہر لمحہ طلب کرنہ مجھے
رات کے پچھلے پہر مانگ! دعاہوں میں بھی

بڑا خوبصورت اظہار خیال ہے۔ہر لمحہ کی طلب محبت کی معنویت کھو دیتی ہے۔کسی چیز کے پانے کے لئے ایک مخصوص وقت ہوتا ہے اس لئے طلب کا وقت بہتر ہونا چاہئے۔موقع حسب حال ہونا چاہئے۔جس طرح دعا کی شرف قبولیت کے لئے رات کا پچھلا پہر زیادہ کارآمد ہے کیونکہ اس وقت موسم بڑا سہانا ہوتا ہے۔فضاؤں کی تازگی اور بہاروں کی دلکشی کا پُر کیف منظر ہوتا ہے یہ سحر خیزی انسان کو مدہوش کر دیتی ہے۔نیند خواب غفلت کی آغوش میں ڈالنا چاہتی ہے مگر اس وقت کی حقیت سے جو واقف ہیں وہ یہ لمحہ ضائع نہیں کرتے ہیں۔اس پُرسکون وقت میں اپنی طلب اور تمناؤں کو کامیاب کرتے ہیں کیونکہ دعا کی طرح محبوب کو یہی وقت وصل کا میسر آتا ہے:

رات ٹھہرے ہوئے دریا میں بہت ہلچل تھی
میری تنہائی کے ساحل پہ کوئی اترا تھا

اس بھاگتی دوڑتی زندگی میں انسان اپنے آپ کو بھول گیا ہے۔دن بھر کی تھکن اور الجھن میں رات ختم ہو جاتی ہے۔وقت ٹھہرے ہوئے دریا کی مانند ہے۔بدحواسی میں رات کٹتی ہے مگر

اس ٹھہرے ہوئے دریا میں یکا یک طغیانی پیدا ہو جاتی ہے. جس سے شاعر کو حیرت ہوتی ہے۔ یہ حیرت ناک لمحہ محبوب کی یاد آوری سے پیدا ہوتا ہے جو آج کے دور کی ایک نئی بات ہے۔

چھو کے اک شخص کو پرکھا تو ملمع نکلا
اس کو میں کیسا سمجھتا تھا وہ کیسا نکلا

آج انسان حقیقت سے پرے زندگی گزار رہا ہے۔ دھوکا دھڑی کا بازار گرم ہے۔ لوگ ایک چہرے پر کئی چہرے لگائے ہوئے ہیں۔ اپنی اصلیت چھپا کر مکروفریب کا خوش رنگ لبادہ پہنے ہوئے ہیں۔ اندر کچھ ہے باہر کچھ ہے۔ ظاہر و باطن میں بڑا فرق آ گیا۔ جب واسطہ پڑتا ہے تو حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے۔

مظہر امام کی شاعری نئے زمانے سے ہم آہنگ ہے۔ مسائلِ غم حیات سے وابستہ ہے. جس کے اندر روایت کا احترام بھی ہے۔ جدید فکروفن کی لطافت بھی ہے۔ ان کے اسلوب کا سلونا پن من موہک ہے اور اس میں قلبی سکوں اور اپنائیت ملتی ہے۔ نئی غزل کا جب بھی تذکرہ ہوگا، اس میں مظہر امام کا نام اپنی انفرادیت سے ممتاز ہوگا۔ اب میں اپنی بات مظہر امام کی شاعری پر غلام ربانی تاباں کے درج ذیل جملوں پر ختم کرتا ہوں:

> ''مظہر امام کے کلام میں زبان و بیان کی پختگی، لہجے کی سنجیدگی، جذبے کی شدت اور بدلتے ہوئے حالات کا شعور بھر پور موجود ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جذبات و تاثرات کے ساتھ عصری رجحانات کا اظہار بھی کیا ہے اور یہ ان کے کامیاب شاعر ہونے کی دلیل ہے۔''

☆

علیم اللہ حالی

نام: سیّد علیم اللہ حالی

ولدیت: سیّد احمد

تاریخ پیدائش: ۱۹۴۱ء

تعلیم: ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی

وطن: مشکی پور (سابق ضلع مونگیر، حال ضلع کھگڑیا)

پتہ: وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱

پیشہ: تدریس (سابق صدر شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا)

تصانیف: ۱۔ سفر جلتے دنوں کا (شعری مجموعہ)

۲۔ احتساب (تنقیدی مضامین)

۳۔ نخلِ جنوں (شعری مجموعہ)

۴۔ اعتبار (تنقیدی مجموعہ)

۵۔ ہم مسافر جہاں جہاں گزرے (سفرنامہ)

۶۔ شاخیں (شذرات)

۷۔ پرویز شاہدی (ایک مونوگراف، مطبوعہ ساہتیہ اکادمی، دہلی)

۸۔ لفظ، آواز، صورت گری (نظموں کا مجموعہ)

۹۔ فردوفن (مقالات)

علیم اللہ حالی

پروفیسر علیم اللہ حالی سابق صدر شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی (بودھ گیا) ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اب گیا میں سکونت پذیر ہیں اور ادب میں ان کی پہچان شاعر، نقاد، مبصر اور مدیر کی حیثیت سے ہے۔ بحیثیت شاعر ان کی شناخت نظم سے یا غزل سے ہے یہ سوال بڑا مشکل ہے۔ کچھ لوگ ان کی شناخت نظموں سے کرتے ہیں مگر میں انہیں غزل کا شاعر مانتا ہوں کیوں کہ ان کی غزل میں 'فکر و فن' کی روشنی ملتی ہے۔ عصری حسیت، وجدانی کیفیت اور اسلوب کی شیرینی گھل مل کر ان کے کلام میں معنویت کی نغمگی بکھیرتی ہے۔ یہ ساری چیزیں انہیں ایک اچھے غزل گو کی پہچان عطا کرتی ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ ان کے مزاج میں یک رنگی نہیں پائی جاتی ہے۔ کبھی زلفِ غزل سنوارتے ہیں۔ کبھی شانۂ نظم تھپتھپاتے ہیں۔ کبھی نقد و نظر سے چشم یار کی نوک پلک بناتے ہیں۔ کبھی چاند کے داغ پر تبصرہ کرتے ہیں۔ کبھی غم جاناں ترتیب دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت ایک ہرے بھرے چمن کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ جس میں ہزاروں طرح کے پھول کھل کر رنگ، روشنی، خوشبو اور تازگی بکھیرتے جاتے ہیں۔

چوں کہ میرا موضوع سخن ان کی غزل ہے اس لئے میں ان کی شخصیت کو ان کی غزلوں کے آئینے میں دیکھنا چاہوں گا۔

میں جب بھی علیم اللہ حالی کی غزل سے آشنا ہوتا ہوں تو انہیں اپنے ہم عصروں

میں ایک اچھا غزل گو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ان کی غزل کے اشعار انہیں عصر حاضر کے اچھے غزل گو کی فہرست میں لے آتے ہیں کیونکہ ان کے خیالات اور محسوسات نئی غزل کے رنگ و آہنگ میں ڈھل کر ملتے ہیں جس میں زندگی کے حزن والم کے ساتھ ساتھ کیف ونشاط کا سرور بھی ملتا ہے۔غزل میں آئینہ ان کا خاص استعارہ ہے۔ آئینہ جو کہ شناخت کا ذریعہ ہے۔عرفان ذات وکائنات کا ماحصل ہے۔آئینے میں انسان اپنے چہرے اور قد وقامت کے نقش ونگار کو دیکھتا ہے اسی آئینے میں جان غزل اپنی خوبصورت تصویر دیکھ کر حسن و جمال کے فہم وادراک حاصل کرتی ہے یہ آئینہ ہمیں خوش رنگی اور خوش نظری کے شیشے بھی عطا کرتا ہے۔یہی آئینہ انسانیت کی بگڑی ہوئی تصویر بھی دکھاتا ہے،لہولہان چہرہ بھی پیش کرتا ہے، بدنمائی کے داغ بھی اُبھارتا ہے۔زمانے کا کریہہ منظر بھی پیش کرتا ہے۔یعنی آئینے کے پاس جیسی صورت آتی ہے ویسا چہرہ دکھاتا ہے شاید اسی لئے علیم اللہ حالؔی نے بھی غزل میں آئینہ گری اور آئینہ سازی کے فن کو پہچانا، اس کا فہم وادراک حاصل کیا اور اس کے مختلف پہلو کو مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور آئینے کے نئے رُخ کو تلاش کر کے اپنی غزل میں پیش کیا ہے:

ہر ایک چہرہ میں اِک دلکشی غضب کی ہے
میں خوش نظر ہوا ہاتھوں میں آئینہ بن کر

آئینہ بن کر تمام چہروں کو دیکھنا واقعی خوش نظری کی بات ہے جس میں مناظر فطرت اور مظاہر قدرت انگڑائیاں لیتی ہیں۔دنیا کی ہنستی مسکراتی تصویر نظر آتی ہے۔اس کی دلکشی اور جاذبیت سے روح سرشار ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے مگر یہ آئینے کا ایک ہی رُخ ہے۔اس کا احساس انہیں جلد ہی ہو جاتا ہے اور جب یہ دوسرا رُخ تلاش کرتے ہیں تو وہ اور بھی زیادہ آب وتاب کے ساتھ اُبھرتا ہے جس میں انسان کے دکھ درد کی روتی بلکتی تصویر نظر آتی ہے۔زخموں سے لہولہان چہرے اپنی ذات کی شکست وریخت کی آواز لگاتے ہوئے ملتے ہیں:

مجھے بھی دیکھو کہ اِک ٹوٹا آئینہ ہوں میں
سبھوں کو اپنی طرح چور دیکھتا ہوں میں

اور شاعر کو غم ذات کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔جس میں غمِ کائنات کا چہرہ بھی دکھائی دینے لگتا ہے۔ذہنی انتشار اور الجھنوں کے اس دور میں خودنمائی کی تصویر اُبھرتی ہے۔جس میں انسان بالکل تن تنہا ہو جاتا ہے اور تنہائی کا وقت اس کے لئے عذاب بن جاتا ہے:

کچھ اور درد اُٹھایا ہے آئینہ بن کر
اُبھر رہا ہوں میں تصویر خودنما بن کر

اور یہ خودنمائی ایسی صورت اختیار کر جاتی ہے کہ انسان کے نقش ونگار مٹنے لگتے ہیں۔ذہنی انتشار، ناکامی، مجبوری، مایوسی، دکھ، درد، گھٹن چہرے کی اصل پہچان مٹانے لگتی ہے زندگی خوف وتنہائی کے دھندلکوں میں کھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔بے چہرگی اور ناشناسائی کے غار میں انسان ڈوب جاتا ہے:

ناشناسی کا ہمیشہ غم رہا
آئینہ بھی اپنا نامحرم رہا

مگر علیم اللہ حالی ناشناسائی کے غم کو بھلا کر اپنے آئینے سے پھر روبرو ہوتے ہیں اور اس بار وہ ایک نئی صورت بنا کر آتے ہیں۔یہی نئی صورت انہیں اپنے ہم عصروں میں انفرادیت بخشتی ہے، یہی پہچان انہیں آئینہ شناسی اور آئینہ گری کا ہنر سکھاتی ہے اور یہی ہنر انہیں اپنے فکروفن کے نقطۂ عروج پر پہنچا دیتا ہے:

گذرا ہر ایک شخص مجھے دیکھتا ہوا
گویا میں آدمی نہ ہوا آئینہ ہوا

انکی غزل ایسا نہیں ہے کہ صرف آئینہ کے ارد گرد ہی بیٹھی رہی ہے۔ آئینہ ان کی غزل کا ایک پہلو تھا جسے میں نے اب تک پیش کیا ہے۔ آیئے اب میں آئینے سے ہٹ کر ان کی غزل کے کچھ اور پہلو دیکھتا ہوں جہاں یہ اپنے ہاتھوں میں چیخ کا پتھر اُٹھا کر پھینکنا چاہتے ہیں جس سے وقت کا سویا ہوا صحرا جاگ سکے:

اِک چیخ کا پتھر ہی سہی پھینک تو حالؔی
اب وقت کے سوئے ہوئے صحرا کو جگا بھی

جب دیکھتے ہیں کہ وقت کا صحرا کا جاگنا مشکل ہے تو دریا کی طرف یہ کہتے ہوئے رُخ کرتے ہیں:

میں اپنے ہاتھ کے پتھر نہ پھینکتا تو علیمؔ
نگل چکا تھا مجھے بھی سکوتِ دریا آج

زندگی کی دھڑکن کو انہوں نے سنا ہے اس لئے خامشی کے ہجوم کو توڑنا چاہتے ہیں۔ بند کمرے میں جینا نہیں چاہتے ہیں کھلی فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں۔ اپنے کمرے سے باہر نکل کر شہر کی رنگینیاں اور رونقوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔

شام کے وقت تو کمرے سے نکل کر دیکھو
اس بھرے شہر میں کوئی بھی تو اپنا ہوگا

اور جب یہ تلاش و جستجو کامیاب ہوتی ہے، کوئی اپنا ملتا ہے تو دوستی یوں رنگ لاتی ہے:

آج بھی تیری گلی میں ہی رہوں گا شب بھر
آج کی رات بھی گھر میرا اکیلا ہوگا

کسی کی گلی میں جب رات گذرنے لگتی ہے تو احساسِ جمال اور رنگِ ملال نئی نئی صورتوں میں اُبھرتا ہے۔ ہمت، حوصلے، بے بسی، بے چارگی، امنگ، ترنگ، حسرت، آرزو و تمنا، طلب، محرومی

ناکامی، شعورِ ذات اور کائنات کا درد اس طرح بخشتی ہے۔

سارے دن سگریٹ کے مرغولوں میں بند
رات بھر خوابوں کا قید ی تھا کوئی

چاندنی سڑکوں پہ آوارہ پھری
بند گھر میں ظلمتوں کا غم رہا

کھلی آنکھ میں تتلیوں کا تھا رقص
بڑھا ہاتھ تو کوئی پیکر نہ تھا

ابھرتی ڈوبتی لہروں کا اعتبار ہی کیا
یہ کس سفر پہ چلا لے کے ناخدا مجھ کو

میں ریزہ ریزہ سرِ رہ گذار پھیلا ہوں
وہ انتظار میں ہے میرے لمحہ لمحہ آج

یقیناً ان اشعار میں زندگی کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ سگریٹ کے مرغولوں میں خوابوں کے قیدی کا بند ہونا، چاندنی کا سڑکوں پہ آوارہ پھرنا، بند گھر میں ظلمتوں کا غم ہونا، کھلی آنکھ میں تتلیوں کا رقص ہونا، اُبھرتی ڈوبتی لہروں کا اعتبار نہ ہونا، ریزہ ریزہ سرِ رہ گذار پھیلنا، انتظار میں لمحہ لمحہ ہونا ــــــ یہ سارے مناظر زندگی سے بہت قریب تر ہیں اور جینے کی ایک نئی تصویر پیش کرتے ہیں۔ زندگی کے ان تمام کھیل تماشوں کو علیم اللہ حالی

چھوڑنا نہیں چاہتے ہیں

گرفت سخت نہ ہوتی جو انگلیوں کی مری
نکل چکا تھا کہیں ہاتھ سے تماشہ آج

مگر اس تماشے میں کھونے پانے کا احساس انہیں صرف زخم نہیں بلکہ مسرت و شادمانی کے ساتھ حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔

ہم گرے بھی تو انا کے غار میں
ٹوٹنے پر بھی وہی دم خم رہا

شکست وریخت کے بعد بھی یہ دم خم ایک نیا حوصلہ بخشتا ہے اور یہ حوصلہ جدید غزل میں انہیں نئی پہچان عطا کرتا ہے۔ ان تمام اشعار کی روشنی میں علیم اللہ حالی کی شخصیت اپنے ہم عصروں میں انفرادیت کے ساتھ اُبھرتی ہے جن کے اندر جدید غزل کے میلانات نئے نقوش چھوڑتے ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ زندگی کے اس بیش قیمتی لمحات میں جناب علیم اللہ حالی اردو ادب کو اور بہتر غزلوں سے نوازیں گے جن کے اندر فکر و فن کے نئے گوشے روشن ہوں گے اور جو بات ادھوری رہ گئی ہے وہ سامنے آئے گی جس کا احساس انہیں خود بھی ہے

بس اِک فریب بیان و صدا ہے نغمہ و شعر
جو بات کہنے کی ہے میں نے وہ کہی ہے کہاں

پرکاش فکری

نام: ظہیر الحق

ولدیت: مولوی محمد ذکریا

تاریخ پیدائش: ۲؍اگست ۱۹۳۱ء

تعلیم: میٹرک

وطن: انبالہ (ہریانہ)

پتہ: ڈورنڈا، رانچی

پیشہ: سرکاری ملازمت (سبکدوش)

تصانیف: سفر ستارہ (شعری مجموعہ)

پرکاش فکری

پرکاش فکری کا تعارف ان کے شعری مجموعہ ''سفر ستارہ'' میں جابر حسین نے یوں کیا ہے۔

''پرکاش فکری ترقی پسند تحریک کے بعد اور جدیدیت کے ہنگامے سے ذرا پہلے اُفق شاعری پر طلوع ہوئے اور بہت جلد آسمان ادب پر چھا گئے۔ ہندو پاک کے معتبر اخبار و جرائد میں ان کی غزلیں متواتر شائع ہوتی رہیں ان کے اشعار زبان زد بھی ہوئے اور ان اشعار کے حوالے سے پرکاش فکری کے شاعرانہ شعور کی شناخت اور ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔''

پرکاش فکری اپنے عہد کے ایک اہم غزل گو ہیں ان کے اسلوب کی سادگی و پُرکاری ان کی پہچان ہے۔ صاف ستھرے سیدے سادے لفظوں میں اپنے خیالات کا اظہار انوکھے انداز میں کرتے ہیں۔ یہی انوکھا پن ان کی شاعری کو انفرادیت کے رنگ روغن عطا کرتی ہے اور راہ عام سے الگ ان کی شناخت بناتی ہے۔

گھاٹ کنارے توڑے اس نے بستی پہ چڑھ دوڑی
چھچھلی ندّی ایک ذرا سی بارش پہ اترائی

سانپوں کے سر سے زہر کا نشہ اتار کے
موروں نے چیخ چیخ کے سر پہ اٹھایا بن

کلنڈر کے اوراق اُڑنے لگے
ہواؤں سے کھلنے لگیں کھڑکیاں

مچھلیاں ریت پہ ساحل کی پناہیں ڈھونڈیں
کچھ عجب غیظ سے اٹڈا ہے سمندر اب کے

خمیدہ بید کی شاخوں کو چھوتی
رواں خاموشیوں میں آب جو ہے

ہماری ناؤ ہے کاغذ کی پھر بھی ضد اس کی
ہوا کا زور ندی کی ترنگ دیکھیں گے

دل گرفتہ میں پیڑ باغوں میں
رنگ روٹھے ہوئے ہیں پھولوں سے

ان اشعار سے پرکاش فکری کی انفرادیت نمایاں طور پر جھلکتی ہے اور ایک اچھوتے لب ولہجہ کا احساس ہوتا ہے جس طرح نظیر اکبرآبادی کے یہاں اپنا اسلوب ملتا ہے۔ ان کی شاعری اسی اسلوب کے اچھوتے پن سے ایک منفرد پہچان بنا لیتی ہے۔ یہی پہچان

انھیں اپنے عہد میں ممتاز کرتی ہے اسی طرح پر کاش فکری بھی اپنے ہم عصروں میں اپنے اسلوب کے ذریعہ دور ہی سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ پر کاش فکری فطرت سے بہت قریب تر دکھائی دیتے ہیں آس پاس کے مناظر سے ایک اچھوتا منظر تلاش کرتے ہیں اور اُسے اپنے شعری کیمرہ میں قید کر لیتے ہیں۔

سردیوں کے دن کی اتنی یاد ہے باقی بچی
بید کی کرسی کتابیں دھوپ کی پیاری ہنسی

معنویت کے لحاظ سے یہ شعر اتنی اہمیت نہیں رکھتا ہے مگر منظر کشی میں حقیقت کا آئینہ دار ہے اور پوری طرح سے فطری دکھائی دیتا ہے اسی خیال میں جب جذباتیت اور جمالیات کے رنگ و روغن ملتے ہیں تو شعر یوں ہو جاتا ہے۔

یخ بستہ زندگی میں آتی ہے یاد اس کی
جاڑے کی دھوپ جیسا جو مہرباں کبھی تھا

برساتی میں برساتی ندیوں کا جوش قابل دید ہوتا ہے گاؤں اس کی قہر سے سیلابی صورت حال سے دو چار ہو جاتے ہیں یہ منظر بڑا دلکش اور دلدوز بھی ہوتا ہے۔ ندی نالے، تالاب جو گرمی میں سوکھے ہوئے نظر آتے ہیں وہ جل تھل ہو جاتے ہیں اور اس سے جو صورت حال پیدا ہوتی ہے اس کی منظر کشی کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں۔

گھاٹ کنارے توڑے اس نے بستی پہ چڑھ دوری
چھچھلی ندی ایک ذرا سی بارش پہ اترائی

غزل میں چھچھلی ندی کا استعمال بھی غالباً پہلی بار ہوا ہے اور بڑا خوبصورت ہے گھاٹ کنارے توڑ کر بستی پہ چڑھ دوڑنے کی پیش کش بھی حقیقی ہے

آ کے وہ اکثر رکی ہے ان درختوں کے تلے
جانے کس کو ڈھونڈتی ہے ان درختوں کے تلے

یہ شعر بھی پارک اور کالج وغیرہ کے آس پاس کی پریم کہانی کہتا ہوا نظر آتا ہے اور فطری ہے۔

گاہے گاہے دیکھتی تھی میری جانب پیار سے
اس کے دانتوں میں دبی تھی ایک پتی گھاس کی

ایک معصوم لڑکی کا فطری منظر یہاں بہت خوبصورتی کے ساتھ نظر آتا ہے لوگوں کو اب تک دانتوں میں انگلی دبانا ہی یاد تھا مگر دانتوں میں ایک پتی گھاس کی دبانا ایک نیا اور اچھوتا منظر پیش کرتا ہے اور فطری بھی ہے۔

تڑپ کے رہ گئی پانی کی گود میں مچھلی
سمٹ کے رہ گیا ساحل یہ جال ریشم کا

یہاں بھی خوبصورت منظر نامہ ملتا ہے جو استعاراتی کشش سے لبریز ہے زبان و بیان میں شیرینی بھی ہے۔

نل پہ کھڑا تھا بھیڑ میں پانی کے واسطے
اس پر پڑی نگاہ تو سیراب ہو گیا

یہ شعر بھی غریبوں کے مسائل زندگی سے نکلتا ہوا منظر نامے کا عکاس ہے اور انسانی ہوس کے فطری تقاضوں کو پیش کرتا ہے اس طرح جہاں کہیں بھی انھیں کوئی اچھوتا منظر ملتا ہے وہ اسے الفاظ کا جامہ پہنا کر شعری پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ پرکاش فکری کے اشعار بڑے صاف ستھرے دھلے دُھلائے اسلوب کے ساتھ ملتے ہیں اور ان کے اندر ایک الگ قسم کا کلاسیکی رکھ رکھاؤ بھی ملتا ہے لہجے کی نرمی سے خاموشی و تنہائی کا جمود پگھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے ان کے یہاں نہ جذبات کی شدت ہے نہ احساسات کی تندی و ترشی ان کے خیالات کی روانی دھیمے دھیمے اپنے منزل کی طرف گامزن نظر آتی ہے ان کا فکری بہاؤ بادِ نسیم کے جھونکوں کی طرح چلتا ہوا نظر آتا ہے اسی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہوئے چند اشعار پیش ہیں۔

میری زباں تو حرف شکایت سے دور تھی
پھر بھی وہ شرمسار سا کترا یا سا رہا

اُڑتے جو پرندے کی طرح ہم بھی ہوا میں
ہر شام نئی شاخ کی بانہوں میں اُترتے

میں جو پہنچا اپنی سچائی لئے
سب کی آنکھیں تھیں بڑی حیران سی

فقیری کا مجھ کو بھی رتبہ ملے
نہ دولت کی چاہت نہ لٹنے کا ڈر

جس پہ چڑیوں کا جمگھٹا رہتا
پیڑ آنگن میں وہ لگانا تھا

پرکاش فکری کے اشعار میں کہیں کہیں زبان وبیان کی لڑکھڑاہٹ بھی محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ ایسی بے دھیانی آج کل کے شاعروں کے یہاں اکثر نظر آتی ہے دراصل آج کے انسان کی زندگی بہت مصروف ہے نہ اُسے سوچنے کا وقت ملتا ہے نہ اُسے کچھ سمجھنے کی مہلت ملتی ہے ہر کام مشینی طرز پر فاسٹ کمپوٹر کی طرح کرنا پڑتا ہے زندگی عجب بھول بھلیوں میں گھری ہوئی ہے میں نے جہاں جہاں ان کے اشعار میں کھٹک محسوس کی ہے ان کی نشاندہی کسی مضبوط دعوے دلیل کے ساتھ نہیں بلکہ طفلِ مکتب کی حیثیت سے کر رہا ہوں۔

کون فکری وہ تو کب کا اس نگر سے چل دیا
اس گلی میں کوئی اب اس نام کا رہتا نہیں

''چل دیا'' کی جگہ ''جا چکا'' کا محل تھا اس لیے ''جا چکا'' کہنا چاہئے تھا۔

شہروں کی بھیڑ سے اب دور جائیں گے
تنہائیوں کی گود میں گھر اِک بسائیں گے

''گود'' سے زیادہ مناسب ''چھاؤں'' ہے اگر گود کی جگہ چھاؤں کہتے تو زیادہ بہتر تھا۔

نیلے فلک پہ آئے گا جب چاند ڈولتا
پتے ہوا کی راگ پہ تالی بجائیں گے

نیلے کی مناسبت سے ''گگن'' زیادہ بہتر تھا۔

بھیک پانے کو ذرا بھیس تو بدلا ہوتا
تیرے ملبوس کی خوشبو ہے تو نگر جیسی

''خوشبو'' کی جگہ ''صورت'' زیادہ بامعنی ہے اور بھیک صورت پہ ملتی ہے ہے نہ کہ خوشبو پہ

رنگ اُڑنے لگا پتوں کا ہرے موسم میں
پھول کٹتے ہیں ہوا تیز ہے خنجر جیسی

''رنگ اڑنے لگا پتوں کا'' کی جگہ ''ریزہ ریزہ ہوئے پتے بھی'' کہتے تو زیادہ بہتر ہوتا جس سے پھول کے کٹنے کی مناسبت سے پتوں کے ٹوٹنے بکھرنے کا عمل واضح ہو جاتا ہے۔ اور ظاہری بات ہے جب پتے ٹوٹ جائیں گے تو رنگ اڑنے کا عمل شروع ہو جائے گا اس لیے رنگ اُڑنے سے پہلے پتوں کا ٹوٹنا بکھرنا زیادہ حقیقی ہے۔

ہم تو ٹھہریں گے، یہیں اور کہاں ہے جانا
تم جو چاہو تو چلے جاؤ جہاں ہے جانا

''کہاں ہے جانا'' اور ''جہاں ہے جانا'' کی جگہہ ''کہاں جانا ہے'' جہاں جانا ہے'' کر

دینے سے زیادہ روانی آجاتی ہے۔

پرکاش فکری کی غزلوں میں جنگلوں، صحراؤں، پہاڑوں، دریاؤں سمندروں، بیابانوں اور کھنڈروں کے منظرنامے جابجا ملتے ہیں اداسیوں اور تنہائیوں کے دکھ درد کا بیان بھی ملتا ہے ان کے اشعار مثنویوں کی طرح ڈرامائی خوفناک مناظر پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر مثنویاں داستانی مناظر بیان کرتی ہیں ان کی غزلیں زمانۂ حال کی تنہائیاں، اداسیاں، خاموشیاں کی کربناک آواز سناتی ہوئی ملتی ہیں۔ اپنی غزلوں کی زمین بھی یہ مثنوی کی مرغوب بحروں سے نکالتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مثنوی کی طرح غزل کا ہر شعر باہم مقفٰی نہیں ہوتا زمانہ حال میں مثنوی کا فن معدوم نظر آتا ہے۔ بہت کم شعراء کرام مثنوی پر طبع آزمائی کرتے ہوئے ملتے ہیں کبھی کبھار، خال خال ہی کوئی شاعر مثنوی پر طبع آزمائی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے پرکاش فکری کی غزل مثنوی کی چاشنی سے بھرپور ہے زبان و بیان کے اس البیلے شاعر کو اگر ہم مثنوی نما غزل گو' کے خطاب سے نوازیں تو بے جا نہ ہوگا۔

صدّیق مجیبی

نام: ڈاکٹر صدّیق مجیبی (گدّی)

ولدیت: محمد مجیب الرحمٰن

تاریخَ پیدائش:

تعلیم: ایم۔اے (اُردو، سوشیالوجی) پی۔ایچ۔ڈی

وطن: رانچی

پتہ: سنٹرل اسٹریٹ، ہندپیڑھی، رانچی

پیشہ: درس وتدریس

تصانیف: شجرِ ممنوعہ (غزلوں کا مجموعہ)

صدیق مجیبی

صدیق مجیبی کا شعری مجموعہ ''شجر ممنوعہ'' جسے جابر حسین نے ترتیب دیا اور اردو مرکز عظیم آباد (پٹنہ) نے شائع کیا ہے۔ اس میں جابر حسین نے انہیں یوں تعارفی کلمات سے نوازا ہے۔

''بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی کے دوران ادبی افق پر ابھرنے والے شعراء میں صدیق مجیبی کا نام نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔''

اور پھر ان کی شاعری پر کچھ اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

''صدیق مجیبی کی شاعری کا ایک نمایاں وصف ان کا راست اظہار ہے۔ وہ چھپا کر اپنی محسوسات بیان کرنے کے قائل نہیں ہیں اس راست انداز اور شعوری معصومیت نے اکثر ان کی شاعری کو ایک روحانی تقدس سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ صدیق مجیبی کی غزلوں میں تشکیک اور تجسس کا پہلو بھی قاری کو حد درجہ متاثر کرتا ہے۔''

جابر حسین نے صدیق مجیبی کی جس راست اندازی، شعوری معصومیت، تشکیک و تجسس کے بیان کا اظہار کیا ہے۔ اسے ان کی غزلوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی غزل ہمیں ایسے اشعار سے نوازتی ہوئی ملتی بھی ہے:

زباں کانٹوں پہ رکھی، پھول آنکھوں سے لگا رکھا
مجھے میرے طریق کار نے سب سے جدا رکھا

تم نے آئینے پہ کیوں اتنا بھروسہ رکھا
ہم تو پتھر ہی سمجھتے تھے سب جانتے تھے
صبح نیزے پہ اُٹھائے لئے پھرتی ہے مجھے
رات خنجر کی طرح دل میں اُترتی کیوں ہے

محبت کے بدلے محبت نہ مانگ
کہ یہ سلسلہ کار و باری نہ رکھ
ہم دشمنوں میں اپنی زباں ہار آئے ہیں
جب ہاتھ کٹ چکے ہیں تو تلوار آئی ہے

یہ اشعار صدیق مجیبی کی راست گوئی اور شعوری معصومیت کی دلیل دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔انہوں نے جس سادگی اور راست گوئی کو اپنایا ہے اس میں ان کے فکروفن کا حسن و جمال ابھر کر سامنے آتا ہے۔اس سے ان کی شخصیت کے قد کی بلندی کا پتہ چلتا ہے۔

صدیق مجیبی کی غزل میں تشکیک و تجسس کے پہلو بڑے انوکھے انداز میں ملتے ہیں۔ان کے اندر خوف و ہراس کا فطری منظر ابھرتا ہے۔جس سے عصری حسیت، زندگی کے نت نئے رنگ اپنی دل نشینی اور دل ربائی کے ساتھ ملتے ہیں۔ آیئے صدیق مجیبی کے ان اشعار پر روشنی ڈالتے ہیں۔جن کے اندر تشکیک و تجسس کی اثر آفرینی ملتی ہے۔

شام ٹھہری نہ سرِ شام کا منظر ٹھہرا
میں کہاں جاؤں بہت دور میرا گھر ٹھہرا

اس شعر میں حیرت واستعجاب کی بنتی بگڑتی ہوئی صورت کے ساتھ ملتی ہے۔"شام ٹھہری"

اور'' نہ سرِ شام کا منظر ٹھہرا'' سے ہی حیران کن مناظر اُبھرنے لگتے ہیں۔'' میں کہاں جاؤں'' میں خوف وتشکیک کی اک پریشان صورت صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔'' بہت دور میرا گھر ٹھہرا'' بے بسی اور مجبوری کے اظہار کا حیرت میں ڈوبا ہوا لہجہ ہے۔ یہ حیرت و استعجاب کا منظر اتنا فطری ہے کہ اس میں زندگی کے بڑے واضح نقوش ملتے ہیں۔

یہ رشتہ ایسا ہے جس کے سمجھ نہ پاؤں بھید
ساتھ رہوں تو چین نہ پاؤں بچھڑوں تو مر جاؤں

یہاں زمانۂ حال کی عکاسی بڑے سلیقے سے پیش کی گئی ہے۔ یہ شعر حیرت واستعجاب کا رنگ لے کر رشتوں کی حقیقت کو بیان کر رہا ہے۔ اس تیز رفتار دنیا میں جہاں انسان ہزاروں الجھنوں میں گھرا ہوا ہے۔ وقت نے آدمی کو بالکل بدل ڈالا ہے۔ تغیر وتبدل کی دنیا میں رشتے اور ناطے بھی دکھاوے کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ مگر اس کا بھید بڑا عجیب ہو گیا ہے۔ ساتھ رہنے میں بے چینی اور بے زاری ہوتی ہے چھوڑ دینے میں بے موت مرنے کا احساس ہوتا ہے۔ ایک عجیب کشمش ہے۔ رشتوں کا نبھانا بھی مشکل ہے اور چھوڑنا بھی مشکل ہو گیا ہے:

اسے یقین نہ آیا مِری کہانی پر
وہ نقش ڈھونڈ رہا تھا گزرتے پانی پر

بناوٹی دنیا میں ہر چیز بناوٹی لگنے لگتی ہے۔ یقین کی دیوار گر جاتی ہے۔ اعتبار اُٹھ جاتا ہے جس میں اچھے بُرے کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ ایسے میں حقیقت کو منوانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ شاعر اپنے دکھ درد کا حال بیان کر رہا ہے مگر زمانہ یا اس کا محبوب ماننے کو تیار نہیں ہے اور لوگ حقیقت کا ثبوت ڈھونڈ رہے ہیں جو گذرتے پانی پر نقش ڈھونڈنے کے برابر ہے اور یہ بڑی حیران کن بات ہے:

وہ گھر بھی اب کہاں رہا کہ جس میں بس رہے تھے تم
اُجڑ گیا تو ہم نے اس کو اپنے نام کرلیا

تمناؤں اور آرزؤں کا خون ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے۔اسی فریب پیہم کے سہارے انسان زندگی گذارتا ہے۔ یہاں بھی یہی تصویر اُبھرتی ہے۔جن آرزؤں اور تمناؤں کے گھروں میں شاعر نے اپنے محبوب کو بسایا تھا وہ آرزئیں اور تمنائیں ختم ہوچکی ہیں۔ خوابوں کا محل، کھنڈر میں تبدیل ہوگیا ہے۔وہ گھر جس میں شاعر اپنے محبوب کو بسانا چاہتا ہے اُجڑ گیا ہے۔لیکن اس اُجڑے ہوئے گھر کو آج بھی شاعر آباد رکھے ہوئے ہے۔وہ آج بھی اس آباد خرابے سے نہیں نکل سکا ہے۔

خدا اور ناخدا دونوں خجل ہیں حال پر میرے
میں وہ تنکا ہوں جو آغوش طغیانی میں رہتا ہے

غالب نے کہا ہے۔

رنج کا خوگر ہو گر انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

اسی خیال سے استفادہ کرتے ہوئے صدیق مجیبی نے بڑا خوبصورت خیال پیدا کیا ہے۔ شاعر کو مسلسل فکر و غم نے تنکا کے مانند بنادیا ہے۔اس لئے حوادث غم سے ڈر ہی نہیں ہے بلکہ اس تنکے کو آغوش طغیانی سے منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے روانی مل گئی ہے۔جس سے خدا جو شیطان کا استعارہ استعمال ہوا ہے اور ناخدا زمانے کا استعارہ استعمال ہوا ہے دونوں اس تنکے کی بربادی چاہتے ہیں مگر الٹی ہوئی اس صورت حال پر دونوں شرمندہ ہیں خود حیرت میں ڈوب گئے ہیں

کوئی منزل ہم آوارہ مزاجوں کی نہیں ہوتی
ہم اِک جگنو ہیں اور ظلمات کے لشکر میں رہتے ہیں

یہ شعر احمد فراز کے مشہور زمانہ شعر کی یاد دلاتا ہے

ڈھونڈ اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

خانہ خراب اور خستہ حال لوگوں کا مزاج ہی الگ ہوتا ہے ان کی فکر ان کی سوچ مختلف ہوتی ہے۔ یہ پلاننگ سے زندگی گذارتے ہیں نہ یہ کسی آیڈیالوجی کے شکار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ خانہ خراب اور خستہ حال ضرور ہیں مگر سادہ لوح انسان ہوتے ہیں ان کے اندر لالچ طمع فریب نہیں ہوتا ہے۔ یہ اندھیروں میں جگنو کی طرح چمکتے ہیں اس لئے ان کی روشنی کو سورج اور چاند کی روشنی سے تجزیہ نہیں کرنا چاہئے۔ ان کا یہی کمال ہے کہ ظلمات کے لشکر میں بھی چمکتے رہتے ہیں

خدا اپنی خدائی قاتلوں کو سونپ دیتا ہے
گماں ہوتا ہے یہ منظر بہ منظر شام ہوتے ہی

یہ شعر حالات حاضرہ کا خون ریز منظر پیش کرتا ہے۔ شام ہوتے ہی ظلم و ستم اور قتل و غارت گری کا ماحول گرم ہو جاتا ہے۔ جس سے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے خدا نے اپنی خدائی قاتلوں کو سونپ دی ہے۔

صدیق مجیبی کی غزل ہمیں خوف و تشکیک کے بنتے بگڑتے دائرے میں زندگی کے مختلف پہلو سے روشناس کراتی ہے۔ جس میں بے گھری کا دکھ بھی ہے تعلقات کی پامالی بھی ہے، زمانے کی خون ریزی بھی ہے، دل کی جلن بھی ہے آنکھوں کی چبھن بھی ہے، تنہائی کا کرب بھی ہے، بے چہرگی کی چیخ بھی ہے، شناخت کی پکار بھی ہے جستجو کی

تھکن بھی ہے، ٹوٹنے بکھرنے کا احساس بھی ہے کھونے پانے کا غم بھی ہے، وصل کی تڑپ بھی ہے، ملن کی بیزاری بھی ہے اور آرزوؤں کی ڈوبتی ابھرتی آواز بھی ہے یہ ساری چیزیں آج کی زندگی سے جڑی ہوئی ہیں۔ آج کا انسان ان مسائل سے دو چار ہے۔

چند اشعار ہم یہاں پیش کررے ہیں۔ جس سے صدیق مجیبی کے تخلیقی اور فنی شعور کا پتا چلتا ہے:

سورج ایسا سرکش، جیوٹ شام ہوئی تو ڈوب گیا
تم جیتے ہو جیو بھائی اپنا جی تو اوب گیا

بھولی بسری بات ہے لیکن اب تک بھول نہ پائے ہم
مٹھی بھر تاروں کی خاطر اپنا چاند گنوائے ہم

دریا جس کی راہ نہ روکے صحرا جس کے ساتھ چلے
من کی موج میں بہنے والی سیلانی کا نام بتا

آئینہ ہوں کسی پتھر سے شکایت کیسی
چور ہوجانا ہی جب اپنا مقدر ٹھہرا

ہر قدم خطرۂ جاں ساتھ ہے میرے
کانٹوں کی گھنی باڑھ رواں ساتھ ہے میرے

ڈرتا ہوں کہ یہ دن کا لڑھکتا ہوا سورج
اس غار کا منہ بند نہ کردے میں جہاں ہوں

حرص و ہوس کیا موج و ہوا کیا یار مجیبی سوچ ذرا
سونا مٹی بھاؤ ہوا اب چاندی جیسے بال ہوئے

یارب ہوائے وقت سے دستار کیا گری
اِک نا تراش بھی مجھے تو بولنے لگا

نیند آتی ہے تو اِک خوف سا لگتا ہے مجھے
جیسے اِک لاش پہ ہو چیل اترنے والی

لہجے سے کاٹ ڈالی اسی نے رگِ امید
پھر خوش دلی سے آنکھ دبا بھی اسی نے دی

دھوپ کے ٹوٹے شیشے چن کر شام گئی کس اور نہ جانے
جنگل رین بسیرا کرلیں آگے تو سب کوس کڑے ہیں

شیشے میں لگ رہی ہے برہنہ بدن سے آگ
کہتے ہیں لوگ سچ کا زمانہ خراب ہے

ہر زخم بر زبانِ رفو بولنے لگا
میں چپ رہا تو میرا لہو بولنے لگا

اشعارِ محولہ بالا میں سورج سرکش کا جیوٹ شام میں ڈوبنا، مٹھی بھر تاروں کی خاطر چاند کا گنوانا، من کی موجِ میں بہنے والی سیلانی کا نام پوچھنا، آئینے کی پتھر سے بے کار شکایت ہونا، کانٹوں کی گھنی باڑھ کے ساتھ ہونا، دن کے لڑھکتے ہوئے سورج سے غار کا منہ بند ہونے کا خوف ہونا، سونا کا مٹی بھاؤ ہونا، اِک ناتراش کا تو بولنا، لاش پر چیل اُترنے کا خوف ہونا، لہجے سے رگِ امید کا کٹنا، خوش دلی سے آنکھ دبانا، شام کا دھوپ کے ٹوٹے شیشے کا چننا، برہنہ بدن سے شیشے میں آگ لگنا، زخم کا برزبان رفو بولنا اور چپ رہنے پر لہو کا بولنا۔ یقیناً ان علامتوں سے صدیق مجیبی کے تخلیقی شعور کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ ان علامتوں میں نئی غزل کا ایک نیا رُخ اُبھرتا ہے اور نئی غزل کے اس نئے رُخ کی شناخت میں صدیق مجیبی کا نام بڑی اہمیت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔

☆

سلطان اختر

نام:	سلطان احمد
ولدیت:	الحاج شرف الدین
تاریخ پیدائش:	۱۶ر ستمبر ۱۹۴۰ء
تعلیم:	انٹرمیڈیٹ
وطن:	سہسرام
پتہ:	جیل ڈیپارٹمنٹ (ہوم) اولڈ اسکریٹریٹ، پٹنہ
پیشہ:	سرکاری ملازمت
تصانیف:	انتساب (غزلوں کا مجموعہ)

سلطان اختر

جدید ترین غزل گو میں سلطان اختر کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تقریباً چار دہائیوں سے غزل کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ انہوں نے غزل کو ایسی تازگی و شگفتگی بخشی ہے کہ جس پر عاشقین غزل ناز کرتے ہیں اور خود جان غزل بھی ان کی شکر گزار ہے۔

ان کی شاعری میں جدیدیت اور روایت پسندی کا امتزاج ملتا ہے۔ بڑے احترام کے ساتھ انہوں نے روایت کو جدت پسندی کا جامہ پہنایا ہے۔ جدت پسندی کی دھن میں لوگوں کی طرح نہ یہ ادھر ادھر بھٹکے نہ زبان و بیان میں بے حیائی کا رنگ بھرا جس سے اخلاقی شائستگی پہ حرف آتا۔ جب فیشن پرستی کا لیبل لئے لوگ اپنے جامہ سے باہر نکل رہے تھے تو انہوں نے نئے زمانے کی ناشائستگی اور برہنگی سے یہ کہتے ہوئے دامن بچالیا۔

پھٹی پرانی سہی چھاؤں اوڑھ لو ورنہ
برہنہ دھوپ ابھی اور بے حیا ہوگی

سلطان اختر کی غزل ایک نئے رنگ و آہنگ میں ڈھل کر ملتی ہے جس کے اندر زندگی کی لذت آشنا دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ ان کے احساسات و جذبات داخلیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

عمر بھر بیٹھ کے رونا کوئی آسان نہیں
اپنی یادیں بھی لئے جاؤ بچھڑنے والو

رگوں میں دوڑ گئی کس کے قرب کی خوشبو
مِرا خیال تو اس کی طرف گیا بھی نہیں

رات بھر میں دل کی دیواریں برہنہ ہو گئیں
صبح تک وہ ساری تصویریں پرانی لے گیا

ان اشعار میں داخلی حس ہمیں روحانی تقدس کے ساتھ ملتی ہے جس کے تلذذ دل و دماغ کے لئے سکون بخش ہیں۔ سلطان اختر نے بہت سمجھ بوجھ کے ساتھ شاعری کی ہے۔ ان کے فکری و فنی شعور میں پختگی کی جھلک موجود ہے۔ اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ ہنر مندی کے ساتھ پہناتے ہیں۔ انہیں اشعار میں یہ فارسی تراکیب کا استعمال بھی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کرتے ہیں جس سے خیالات کی اثر انگیزی حسن و جمال کے آب و تاب کے ساتھ اُبھرتی ہے۔

ڈھو رہا ہے وہ تعلق کی گراں باری بھی
میری تذلیل بھی کرتا ہے طرف داری بھی

اِک چپ سی لگ گئی تھی مجھے اس کے روبرو
میں سرنگوں کھڑا تھا خطا کے بغیر بھی

دل میں جنگل کی رات خیمہ زن
سر پہ صحرا کی دوپہر کی یارب

ان اشعار میں فارسی تراکیب فنی شعور کے ساتھ برتی گئی ہیں جس سے ان کے اسلوب کی

گرفت کا پتہ چلتا ہے۔ پہلے شعر میں ''تعلق کی گراں باری'' ''تذلیل'' اور ''طرفداری'' دوسرے شعر میں ''روبرو'' ''سرنگوں'' ''خطا کے بغیر'' تیسرے شعر میں ''خیمہ زن' صحرا' اور یارب کا ستعمال ہندی الفاظ کے ساتھ اتنا گھل مل کر ہوا ہے کہ الفاظ اجنبی نہیں لگتے ہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کو معنویت کی منزل تک پہنچانے میں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

سلطان اختر کی شاعری اپنے عہد کی آئینہ دار بھی ہے اسی لئے ان کی غزل میں خوف وتشکیک اور یاسیت کے رنگ غالب نظر آتے ہیں۔ احساس محرومی ، ذہنی انتشار ،زندگی کی تھکان، وقت کی جلن، ملنے بچھڑنے کا دکھ اور ٹوٹنے بکھرنے کا درد جا بجا ملتا ہے جو آج کے عہد کی المیہ تصویر ہے جو حقیقت سے قریب تر ہے۔ نئی غزل میں یہ کرب واحساس کی جھلک تقریباً تمام شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ سلطاں اختر نے بھی اپنے عہد کے دکھ درد کو سمجھا ہے اور اس کی عکاسی کی ہے مگر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ ان کے احساسات وجذبات ہمیں فکروغم کی ایک نئی لذت سے آشنا کراتے ہیں۔

وقت سے پہلے ہی اختر تھک گئی ہے زندگی
موسموں کا قہراحساس جوانی لے گیا

روشنی سے نم آنکھیں تیرگی سے تر چہرے
دوسروں پہ ہنستے ہیں خود سے بے خبر چہرے

تھکی تھکی سی آنکھوں پہ جب بھی خوابوں کی دیوار گری
سہمی سہمی نیند مرے پہلو میں آکر لیٹ گئی

وہی ہانپتے کانپتے روز وشب
وہی سہمی سہمی فضا ہر طرف

ان اشعار سے زندگی کی روتی بلکتی تصویر صاف دکھائی دیتی ہے۔ یہ اشعار اپنے عہد کا مرثیہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وقت سے پہلے زندگی کا تھکنا، موسموں کے قہر سے احساسِ جوانی کا جانا، روشنی سے نم آنکھیں، تیرگی سے تر چہرے، دوسروں پر خود سے بے خبر ہو کر ہنسنا آرزوؤں کی پامالی میں تھکی تھکی آنکھوں پہ خوابوں کی دیوار کا گرنا، سہمی سہمی نیند کا آنا، روز و شب کا ہانپنا کانپنا اور ہر طرف فضا سہمی سہمی ہونا جو نقش بناتے ہیں اس میں زندگی کا کھوکھلا پن، زمانے کی ستم گری، آرزوؤں کی پامالی، خوف و ہراس کے سائے، یاسیت کے رنگ میں لہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سلطان اختر کے یہاں یاسیت کے یہ رنگ قدم قدم پر ملتے ہیں اور اس کا انہیں شدید احساس بھی ہے۔

جسم سالم ہے نہ محفوظ سراپا اپنا
ایسے بگڑا تو نہیں تھا کبھی خاکہ اپنا

کاسۂ دل سے لہو آنکھوں سے پانی لے گیا
اپنا قصہ کہہ کے وہ میری کہانی لے گیا

قصہ، کہانی، روز و شب، شام، سحر، پانی، آگ، چہرہ، پیاس، صحرا، گھر، دیوار، لہو، ذائقہ، برہنہ، آنکھ، دل، پتھر، بارش اور پرچھائی جیسے الفاظ بار بار چکر کاٹتے ہوئے رنگ بدل بدل کر خوف و ہراس اور دکھ درد کی ایک ہی تصویر پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر سلطان اختر ان اداسیوں سے رجاعیت کا پہلو بھی نکالتے تو ان کی غزل نئی غزل میں اور چار چاند لگا جاتی۔

☆

محمد مثنیٰ رضوی

نام: مثنیٰ رضوی

ولدیت: ....

تاریخ پیدائش: ۶ ر نومبر ۱۹۲۸ء اعظم گڑھ

وطن: اکبر پور (فیض آباد) کے قریب مدار پور

تعلیم: شبلی کالج اعظم گڑھ، الہٰ آباد یونیورسٹی، علی گڑھ یونیورسٹی

ریسرچ: مگدھ یونیورسٹی (شعبۂ فلسفہ)

ملازمت: کنگ جارج کالج رسڑا (یوپی)، حسین گنج ہائر سیکنڈری اسکول، مرزا غالب کالج (مگدھ یونیورسٹی) ۱۹۹۱ میں شعبۂ فلسفہ کے صدر کی حیثیت سے سبکدوش (۱۹۷۵ـ۱۹۸۲)، آل انڈیا ریڈیو بھوپال اور اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں پروگرام ایگزیکیوٹو

تنقیدی مضامین اور خاکے: نگار، افکار، معارف، آہنگ، مورچہ، قومی آواز، پہچان، آئندہ، مباحثہ، نیاسفر، نیادور

غزلیں: آئندہ، آجکل، نیادور، نیاورق، نیاسفر

مثنیٰ رضوی

مثنیٰ رضوی شعبۂ فلسفہ مرزا غالب کالج گیا سے درس و تدریس کے فرائض کی سبکدوشی کے بعد وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا میں ہی سکونت پذیر ہیں اور آج بھی کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر عنوان چشتی کا یہ شعر زبان پر مچلنے لگتا ہے۔

تراشتا رہا جو فکروفن کے تاج محل
ابھی تلک وہ کرائے کے گھر میں رہتا ہے

کئی ملازمت سے جڑنے اور بچھڑنے کے بعد آخرش گیا آئے جہاں مرزا غالب کالج گیا میں شعبۂ فلسفہ میں لکچرر کی ملازمت اختیار کی اور آخر تک یہیں سے درس و تدریس کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیتے ہوئے پروفیسر ہو کر سبکدوش ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی نہ جانے کون سی کشش انہیں گیا کی مٹی میں ملی جو انہیں اپنی بانہوں سے جدا ہونے نہیں دیتی ہے۔ شائد مثنیٰ رضوی بھی گوتم بدھ کی طرح عرفانِ زندگی اسی دھرتی پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اردو ادب کی کئی بڑی نامور شخصیتوں کی صحبت کا فیض انہیں حاصل ہے جن میں فراقؔ،، فیضؔ، مجازؔ، ساحرؔ، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، وغیرہم کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کی صحبت کے فیض سے انہوں نے زندگی کے اسرار و رموز کے نکات کو سمجھا اور سیکھا ہے۔ پہلے پہل تنقیدی اور شخصی مضامین سے ادب میں اپنی پہچان بنائی آج کل زندگی کے آخری پڑاؤ پر شاعری کا ذوق شباب پر ہے۔ زندگی کا بھرپور تجربہ شاعری میں

استعمال کررہے ہیں۔ مشاہدات و تجربات کی بھٹی میں جل کر بڑے خوبصورت اشعار پیش کرتے ہیں۔

کوئی بتاؤ کہ اس کاروبارِ ہستی میں
وہ کیا کرے جسے سوداگری نہیں آتی

•

لگا کے آگ مکانوں میں روشنی کے لئے
چراغ دیدہ و دل کے بجھا رہے ہیں لوگ

لوٹ کر آئے تو کچھ بھی نہ رہا پاس اپنے
گھر سے نکلے تھے تو دل میں تھے ارادے کیا کیا

یہ اشعار زندگی کے مشاہدات و تجربات کی آگ میں جل کر سونا سے کندن بنے ہیں ان میں تجربات کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔ یہ اشعار زندگی کی حقیقت کی جیتی جاگتی بولتی تصویر دکھائی دیتے ہیں۔

اصناف شاعری میں صنف غزل کی مقبولیت سے کس کو انکار ہے؟ ہر شاعر اور متاشاعر اس کی اداؤں پر جان دینے کو تیار ہے جس طرح کھانے میں کھچڑی ایک ایسی غذا ہے جسے بادشاہ بھی کھاتا ہے اور فقیر بھی کھاتا ہے دونوں کی یہ مرغوب غذا ہے۔ غذایت سے بھرپور بھی ہے اس کے اندر شہنشاہی کا رنگ بھی ہے فقیری کی بوباس بھی۔ شائد اسی لئے شنی رضوی بھی اپنی شاعری کے لئے غزل سے ہی دامن گیر ہوئے مگر انھوں نے فنِ عاشقی کے اصول سیکھ کر ہی غزل کو محبوبیت بخشی شعر کہتے وقت غزل کی نزاکت اور لطافت کو برقرار رکھا۔ اس کے حسن و ادا کا خاص خیال رکھا۔ جذبات کی مست

خرامی کی ترجمانی کرتا ہوا یہ شعر عرض ہے ۔

اُس کی آہستہ روی تو دیکھ　　موجۂ باد صبا ہو جیسے

مگر جب غزل نے محبوب کی گفتگو کے ساتھ ساتھ زندگی کے اور بھی پہلو کو موضوعِ سخن بنایا یا بنانا شروع کیا تو شمیٰ رضوی بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ غزل کی نئی آواز پر لبیک کیا۔ زندگی کے ان تمام افکار و مسائل کو اپنی غزلوں میں پرونا شروع کیا جن سے آج کے انسان کا واسطہ پڑ رہا ہے۔ ان احساسات و جذبات کی تصویر بذیعہ شعر یوں کھینچنے لگے:

گرانیِ غم دل میں کمی نہیں آتی
کھلے برس کے گھٹا وہ گھڑی نہیں آتی

انسان اپنے دکھ درد کا بوجھ رو کر ہلکا کرنا چاہتا ہے مگر آج کی زندگی میں اسے یہ موقع بھی ہاتھ نہیں آتا ہے۔ دنیا بہت پُر فریب ہو چکی ہے۔ قدم قدم پر دھوکہ دھڑی کا بازار گرم ہے۔ انسانیت تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہی ہے۔ قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ عزت و ناموس مٹتی دکھائی پڑتی ہے۔ ایسے میں سادہ لوح انسان کے لئے جینا مشکل ہو جاتا ہے وہ خوف اور تشکیک بھرے کشمش کے عالم میں اس شعر کی طرح سبیل ڈھونڈتا ہوا دکھائی پڑتا ہے۔

کوئی بتاؤ کہ اس کاروبارِ ہستی میں
وہ کیا کرے جسے سوداگری نہیں آتی

ہمارے آباء و اجداد کل جس حرص و ہوس کو جوتی سمجھ کر ٹھوکر مارتے آئے تھے آج ہماری یہ حالت ہو گئی ہے کہ اچھے برے کی تمیز مٹ گئی ہے۔ لوگ ھما کی تلاش چھوڑ کر اُلو پالنے لگے ہیں۔ ذلت و رسوائی بھلا کر حرص و ہوس کی دولت کو سر کا تاج بنانے کے لئے بے چین ہیں۔

اسی کے سائے سے بچتے تھے سب یہاں کل تک
اسی کے قرب کا خواہاں ہے آج ہر کوئی

انسان انا پرستی کے زعم میں اپنی حقیقت کو بھول بیٹھا ہے اس کی بنیاد ایک ناپاک قطرے سے ہوئی ہے اسے یہ بھی احساس نہیں ہے۔ یہ زعم اور تکبر تو شیطانی چلن ہے جو اسے فرعونیت اور نمرودیت کی راہ پر لاکر برباد کر دیتا ہے۔ انسان کو تو عاجزی وانکساری کا پیکر ہونا چاہئے مگر انسان پر انا پرستی کا ایسا زعم سوار ہے کہ اسے کچھ دکھائی نہیں پڑتا ہے۔

بس ایک میں ہوں نہیں دوسرا ادھر کوئی
انا کے زعم میں آتا نہیں نظر کوئی

ہر طرف بے چینی اور بے زاری کا عالم ہے، جائے پناہ کی تلاش میں انسان مارا مارا پھر رہا ہے مگر اسے کہیں میسر نہیں ہے۔ دنیا انتشار اور تشدد پر آمادہ ہے اس اضطرابی کیفیت میں جس کے اندر انسانیت کی بو باس ہے وہ خاموشی سے شہر کی بارونق زندگی کو خیر آباد کہہ کر گوشۂ تنہائی کے لئے جنگل وصحرا کا رُخ اختیار کرنا چاہتا ہے۔

کبھی جنگل کبھی صحرا، کبھی دل کی بستی
زندگی ہم نے بھی ڈھونڈے ہیں ٹھکانے کیا کیا

اسی طرح مثنیٰ رضوی کی غزل میں زندگی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ آج کے مسائل کی تصویر صاف طور پر جھلکتی ہے ان کی غزل زمانہ حال کی ترجمانی کرتی ہوئی ملتی ہے۔ یہ اپنے دکھ درد کا رو رو کر اظہار بھی کرتی ہے اور مسرت وشادمانی کا مسکرا کر اقرار بھی کرتی ہے۔

☆

عین تابش

نام: عین الحق

ولدیت: سید انوار الحق شہودی

تاریخ پیدائش: ۲۶ دسمبر ۱۹۵۷ء

تعلیم: ایم۔اے (انگلش) پی ایچ۔ڈی

وطن: سہسرام

پتہ: آمداری ہاؤس، شاہ ہارون، سہسرام

پیشہ: درس وتدریس (مرزا غالب کالج، گیا)

تصانیف: ا۔رات کے آخر ہوتے ہوتے (شعری مجموعہ)

۲۔اشک عصا نے نہر نکالی

۳۔اس خوشبو کا یہ قصہ ہے

۴۔نازش سہسرامی اور حرفِ تمنا

عین تابش

عین تابش کی غزلوں کا مجموعہ ''اشک عصا نے نہر نکالی'' پر رونق شہری نے سہ ماہی رنگ میں یُوں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''عین تابش اپنے لہجے کے متانت و بازت کی وجہ سے بہت دوری سے پہچانے جاتے ہیں.........عین تابش کا حزنیہ پوشاک شاعری پر ٹانکا ہوا محسوس نہیں ہوتا ہے بلکہ ملال کی گرد اشک عصا سے نکالی گئی نہر میں فنا ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اشک حزن و ملال کے انعکاس کا ذریعہ محض نہیں ہے دکھی دنیا کے زول کا حشر سمجھنے اور کہنے کا مادہ ہونے کی گواہی بھی دیتا ہے۔''

میں بہت حد تک رونق شہری کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں اور تمثیل کے لیے ان کے چند اشعار عرض کر رہا ہوں ۔

حزن میں ڈوبے در و بام سے ڈرتے ہوں گے
لوگ جب اجڑے مکانوں سے گزرتے ہوں گے

رات کے شہر میں بجتی ہوئی اک بزم خیال
دیکھ دیوانوں کی جنت ہی الگ ہوتی ہے

آج تک کون سا سنبھلا ہے کہ سنبھلے گا تو
میں نے امید ہی اب تجھ سے اُٹھا دی مرے دل

لکھا کرے گا یوں ہی دست شوق حرف ملال
چلا کرے گا یوں ہی کارخانۂ گذراں

دل کو ہر شب لہو کیا ہم نے
اس لہو سے وضو کیا ہم نے

ہر ایک شخص ہے تنہا بھی دل گرفتہ بھی
بہت اداس ہوئی جا رہی ہے دنیا بھی

عین تابش کی یاسیت اُمید کا پرتو ڈھونڈتی ہے۔ حرماں نصیبی شب انتظار میں کٹتی ہے، محبت بام عروج پر پہنچنے کے لیے بے تاب ہے، آنکھیں آنسوؤں سے وضو کرتی ہیں، ہجر کے موسم سے وصال کی خوشبو پھوٹتی ہے اور رنج و غم کے چراغ بجھتے ہوئے نہیں جلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ میر کے دکھ درد اور حزن و ملال کی کیفیت سے الگ اشک عصا سے اپنے غموں کی راہ نکالتے ہیں جہاں میر سے اِن کا فرق واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہے گویا چراغ مفلس کا
میر تقی میر

حیات سوختہ ساماں اک استعارۂ شام
چمک چمک کے بجھا ہے کوئی ستارۂ شام
عین تابش

میؔر کا شعر دل کے جس حزن و ملال کی کیفیت کو بیان کر رہا ہے۔ عین تابش کا شعر بھی زندگی کی اُسی سوختہ سامانی کی بات کرتا ہے۔ میؔر نے دل کو جیسے مفلس کے چراغ سے تشبیہ دی ہے اسی طرح عین تابش نے بھی زندگی کو بجھا ہوا ستارۂ شام کہا ہے مگر دنوں کے شعر میں حزن و ملال کی الگ الگ کیفیت ملتی ہے۔ میؔر نے زیادہ فطری تصویر کشی کی ہے۔ یہاں چراغ کے جلنے کا عمل ختم ہو چکا ہے۔ شام کا حال رات کی ستم آرائیوں سے مختلف نہیں ہے۔ غم کے اندھیروں کی یلغار شروع ہو چکی ہے۔ دل ڈوب چکا ہے۔ آس کے چراغ گل ہو چکے ہیں۔ روشنی کے لیے نگاہیں ترس رہی ہیں مگر عین تابش حیات کو سوختہ سامان کہہ کر بجھا ہوا ستارۂ شام کہتے ہیں۔ میؔر کے چراغ شام کی طرح ان کا بھی ستارۂ شام بجھا ہوا ہے لیکن دونوں کی کیفیت جدا جدا ہیں۔ چراغ شام میں اندھیروں سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے اور نہ یہ جلنے کی کوشش کر رہا ہے مگر ستارۂ شام اپنے بجھنے کی کیفیت بیان کر رہا ہے۔ وہ زندگی کی رمق باقی رکھے ہوئے ہے جس سے روشنی کی جدو جہد کا پتا چلتا ہے۔ ''چمک چمک کے بجھا ہے'' کا ٹکڑا اُسے حیات بخش روشنی فراہم کئے جا رہا ہے یا روشنی کی چمک باقی رکھے ہوئے ہے۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میر تقی میؔر

میاں سفر کا کہاں اختتام ہوتا ہے
اِک اور راہ نکلتی ہے خاکِ تربت سے

عین تابش

عین تابش یہاں میؔر کی یاد تازہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دونوں کے خیالات بہت حد تک ملتے جلتے دکھائی دیتے ہیں۔ عین تابش نے میؔر کے اس خیال سے پُورا فائدہ اُٹھایا

ہے لیکن غور کریں تو دونوں کے خیال میں نازک سا فرق ہے اور یہی فرق عین تابش کو میر کی یاسیت میں گم ہونے سے بچالیتا ہے۔ میؔر کے شعر میں ایک وقفہ ہے۔ ٹھراؤ ہے۔ تھکان ہے۔ دم لینے کی گنجائش ہے۔ مگر عین تابش کے یہاں ٹھہراؤ کی گنجائش بالکل نہیں ہے روانی برقرار ہے سفر کا تسلسل ٹوٹتا ہوا نظر نہیں آتا ہے۔

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

میؔر تقی میؔر

اس چشم کا رک رک کے برسنا دمِ رخصت
سوکھے ہوئے کھیتوں میں گھٹا آئی ہوئی سی

عین تابش

یہاں بھی میؔر کے حزن وملال اور غم واندوہ سے ایک الگ کیفیت نمایاں ہے۔ میؔر نے اپنے شعر میں غم کی انتہائی صورت کو پیش کیا ہے اور اُس کا تاثر ''کاغذ نم رہا'' کہہ کر رنگ شفق کی طرح چھوڑ جاتے ہیں مگر عین تابش نے اپنے غم واندوہ کی ابتدائی صورت کو بیان کیا ہے۔ ''سوکھے ہوئے کھیتوں میں گھٹا آئی ہوئی سی'' کہہ کر اپنی تمناؤں اور اُمیدوں کی ہریالیاں قائم رکھتے ہیں۔ اس شعر میں ''گھٹا آئی ہوئی سی'' کہہ کر عین تابش نے میؔر کے طرز بیان کو اپنایا ہے کیونکہ ''سی'' ''سے'' ''سا'' جیسے لفظ سے حسن کاری میؔر کا خاص طرۂ امتیاز بھی ہے۔

میؔر اور عین تابش میں ایک چیز جو بہت زیادہ ملتی جلتی ہے وہ یہ کہ دونوں نے جب بھی حزن وملال سے باہر نکل کر شعر کہا ہے اُس کی دلکشی دیکھنے کے لائق ہے تمثیل کے لیے ایک ایک شعر دونوں کے عرض ہیں:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر

اتر رہی ہے ملاقات بامِ مژگاں سے
چراغ جلنے لگا ہے تری محبت کا
عین تابش

عین تابش میرؔ کے جیسے بڑے شاعر تو نہیں ہیں مگر انھوں نے میرؔ کی راہ سے ایک الگ راہ نکالی ہے۔ اس لیے ان کے حوصلے، ہمت، جسارت کی داد دینی چاہیے۔ انھوں نے میرؔ کے غم کو تو سلامت رکھا ہے مگر ان کی قنوطیت کو نہیں اپنایا ہے بلکہ ان کے غم کے اندھیروں سے رجاعیت کی روشنی تلاش کی ہے۔

گفتگو ختم کرنے سے پہلے عین تابش کے چند اور ایسے اشعار پر روشنی ڈالنی ضروری سمجھتا ہوں جن کے اندر معنویت اور جمالیاتی ہمہ گیریت، آفاقیت کی جھلک ملتی ہے جس سے ان کی شخصیت کے ساتھ ان کے فکر وفن کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

وہ راستہ کہ جسے ترک کرنا چاہتے تھے
ہزار بار اسی راستے سے گزرے ہیں

انسان کبھی کبھی چاہتے ہوئے بھی اپنی مجبوریوں کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتا ہے۔ کبھی اُس پر بے بسی کی کائی اس طرح جم جاتی ہے کہ اس کا چھوٹنا مشکل ہو جاتا اور مجبوریاں اس کے پیروں کی زنجیر بن جاتی ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے ان چاہے راستوں پر چلنا پڑتا ہے۔ یہاں اسی خیال کی ترجمانی ہے۔

کیسے کیسے جانفزا خوابوں کی دھجی اُڑ گئی
پھر وہی مجبور آنکھوں پر ستم کرتے ہو کیا

دنیا میں آدمی ان گنت خواب سجالیتا ہے۔ آرزوں اور خواہشوں کی انتہا نہیں ہے۔

مگر انھیں آرزؤں اور حسرتوں کو اُسے پامال ہوتے ہوئے بھی دیکھنا پڑتا ہے جنھیں آنکھیں پلکوں پر لیے پھرتی ہیں۔ وہ خواب کے گھروندے مسمار ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن انسان اپنی بربادی اور پامالی کے باوجود فطرت سے باز نہیں آتا ہے۔ انھیں زخمی آنکھوں میں نئے سرے سے خوابوں کی فصل بونے لگتا ہے۔

ہم اپنے چاک گریباں پہ چاندٹا نکتے ہیں
اسی لباس میں ہم کو سفر پہ جانا ہے

یہاں چاک گریباں پہ چاندٹا نکنے کا استعمال کتنی خوبصورت ہنرمندی ظاہر کرتا ہے۔ دنیا زخموں سے بھری ہوئی جگہ ہے۔ انسان اگر اپنے چاک گریباں پہ چاندٹا نکنے یعنی زخموں پہ آنسوؤں کا مرہم رکھنے کا ہنر سیکھ لے تو اس کا سفر آخر پہ جانا آسان ہو جاتا ہے

جب ایک موج سے سر پھوڑتے ہی رہنا تھا
تو سر کو حلقۂ آب رواں میں کیوں رکھا

یہ شعر مقدر کی گرہ کھولتا ہوا نظر آتا ہے اور خداوند عالم سے سوال کرتا ہے کہ جب تیری مرضی کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہلتا ہے تو دنیا میں ہمیں بھیج کر طرح طرح کی آزمائشوں کا کیا مطلب جو مقدر میں لکھ دیتا وہ ہو جاتا ہے۔ جنت جہنم کا کھیل بے کار نظر آتا ہے

جب چاہوں تجھ کو یاد کروں یا بھولوں میں
اُلجھن ترتیب ماہ و سال سے ہوتی ہے

یہاں بھی بڑا چھوتا انداز بیان ہے۔ شعر بڑا حسین پیکر اظہار لئے ہوئے ہے۔ محبت آزادی چاہتی ہے۔ یادآوری اور تغافل کا حساب و کتاب کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ ترتیب ماہ و سال کے شمار سے الجھن ہوتی ہے

کچھ لوگوں کو رخصت بھی کیا کرتی ہے ظالم
رستہ بھی تکا کرتی ہے یہ شام کسی کا

یہاں زندگی کی جیتی جاگتی سچی تصویر نظر آتی ہے اور بالکل فطری پیش کش ہے یہ المیہ بیان حقیقت کا عکاس ہے یہ شعر انشا کے اس شعر کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

''رستہ بھی تکا کرتی ہے یہ شام کسی کا'' ذومعنوی لذت پیدا کرتا ہے۔جس سے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے

کوئی تو سلطنتِ شہر عاشقی لے لے
فقیر شور مچاتا ہوا نکلتا ہے

کتنا پیارا انداز بیان ہے۔میر کی فقیرانہ صدا صاف سنائی دیتی ہے آج کی پُر آشوب دنیا میں انسانیت تڑپ رہی ہے۔میزائل بم بارود بنا کر انسان اپنی تباہی کا بازار گرم کئے ہوئے ہے۔اقتدار و ہوس کی بھوک بڑھی ہوئی ہے۔تخت و تاج کے لئے مارا ماری جاری ہے مگر محبت و اخوت کی راہ پر چلنے کے لئے فقیر آواز لگا رہا ہے۔یہاں فقیر انسان کا استعارہ ہے۔سلطنت شہرِ عاشقی کا تخت و تاج خالی پڑا ہے کوئی تو یہ کاروبارِ محبت سنبھال لے جس سے انسانیت کی شمع روشن ہو جائے۔جس سے یہ دنیا پھر محبت کے سانچے میں ڈھل جائے۔

ان اشعار کی روشنی میں میں کہہ سکتا ہوں کہ عین تابش کی شخصیت ایک اہم غزل گو کی صورت میں ابھرتی ہے۔جس سے غزل گوئی میں ان کا مقام ممتاز و منفرد نظر آتا ہے ان کی غزل میں کلاسیکیت کا حسن و جمال موجود ہے۔فکر و فن کی روشنی پھوٹتی رہتی ہے۔جذبوں کی سحر کاری بھی ہے۔احساسات کی دانش مندی بھی ہے۔ان کے اشعار جوہر شاعری سے مزین ہیں۔جس سے ان کی غزل سدا بہار تازگی و شگفتگی بکھیرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

☆

فردوس گیاوی

نام: عبدالصمد

قلمی نام: فردوس گیاوی

ولدیت: ابوالبرکات (مرحوم)

تاریخ پیدائش: نامعلوم

سن پیدائش: ۱۹۵۶ء

جائے پیدائش: ہسپورہ، سابق ضلع گیا، حال اورنگ آباد (بہار)

آبائی وطن: کنچن پور، بگدااہام ضلع گیا (بہار)

تعلیم: ہائی اسکول

آغازِ شاعری: ۱۹۷۰ء

شرف تلمذ: جناب فرحت قادری

پیشہ: پرائیوٹ نوکری

پتہ: گیوال بیگہہ، نزد منی مسجد، گیا

فردوس گیاوی

فردوس گیاوی کی آغازِ شاعری کا وقت اور میری تاریخ پیدائش کا سال تقریباً ملتا جلتا ہے۔مگر جناب کے تعلقات مجھ سے دوست جیسے ہیں۔ویسے بھی ادب اور انسانیت بھری دوستی کی راہ میں عمر کے فاصلے حائل نہیں ہوتے ہیں۔میرے کئی اساتذہ کرام مجھے اپنے دوستوں میں شمار کرتے ہیں۔بہت سارے ادب نواز بزرگ بھی مجھے اسی فہرست میں شامل کرتے ہیں۔میں بھی اپنے چھوٹوں کے ساتھ اسی پیار اور محبت کے ساتھ ملتا ہوں مگر یہ محبت اور شفقت کسی کی قدر و منزلت نہیں گھٹاتی ہے بلکہ اس کی شخصیت کو اور محترم بنا دیتی ہے۔

فردوس گیاوی کا شعری مجموعہ ''شہرِ ہنر'' ابھی فوراً اشاعت کے مراحل سے گذرا ہے۔امید ہے کہ اہل علم و ادب میں یہ اپنی پہچان بنائے گا اور لوگ اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

فردوس گیاوی اپنے حالات سے الجھے ہوئے شخص کا نام ہے ان کی زندگی بے بسی اور بے کسی کے آنسوؤں میں گذری ہے۔پتا نہیں اس ملک کے دستور اور قانون کیسے ہیں۔جہاں خطِ افلاس سے گرے ہوئے انسانوں کے لئے روٹی روزی کی مدد تو ہوتی ہے اور ان مسئلوں پر حکومت کے پاس سوچنے کی گنجائش بھی ہے۔مگر خطِ افلاس سے گرے ہوئے شاعروں،ادیبوں کے لئے حکومت کے پاس وقت ہے نہ کوئی دستور عمل ہے نہ کوئی ادارہ ان کی مالی معاونت کرتا ہے۔جس سے یہ اپنی زندگی کے مسائل کو حل کر سکیں۔بلکہ فکر

وفن کے کج کلاہ بے حس لوگ ان مفلوک الحال شاعروں کوتو گری نظر سے دیکھتے ہی ہیں ان کے فکروفن کوبھی وہ عظمت اور وقارنہیں دیتے ہیں۔جن کے یہ مستحق ہوتے ہیں۔اردو ادب کی یہ المیہ روایت زمانۂ قدیم سے چلتی آرہی ہے اوران کے حالات پر کوئی سوچنے والانہیں ہے۔ان حالات کے شکار ہزاروں شاعروں کے ساتھ کئی بڑے اہم نامور شعراء کرام بھی ہوئے ہیں۔غالب جیسا عہد ساز شاعر بھی اس کی گرفت سے نہیں نکل سکا ہے۔آج غالب کے نام پر کئی اکیڈمیاں،کئی ادارے قائم ہیں جن سے لوگوں کی روٹی روزی کے مسئلہ کا حل نکل آیا ہے۔کئی لوگ تو اس نام کی بھیک پر عیش وآرام کی چاندی کاٹ رہے ہیں۔مجھے اس حالات میں اپنے استاذ محترم عنوان چشتی یاد آرہے ہیں۔ جنہوں نے اس ناچیز کوشاگردی کا شرف بخشتے وقت ان مسئلوں کا حل بڑے حکیمانہ انداز میں سمجھایا تھا۔اللہ ان کی روح کوکروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔(آمین) خیر یہ باتیں ایک الگ موضوع سے جڑی ہوئی ہیں۔یہاں ان باتوں کا موقع محل تونہیں تھامگر تذکرۂ نکل آئیں ہیں۔

اصل موضوع تو فردوس گیاوی کی غزل گوئی ہے۔جس کے متعلق مجھے قلم کو حرکت دیناہے۔فردوس گیاوی مکمل طور پرغزل کے شاعر ہیں۔غزل گوئی ہی ان کامحبوب مشغلہ ہےاوران کی شناخت بھی غزل ہی سے بنتی ہے۔انہیں اپنی غربت کا خیال بھی ہے۔فکروفن کی پاکیزگی اور عظمت کا بھی خیال ہے۔زمانہ سے بڑے مؤدبانہ انداز میں صاف گوئی کے ساتھ فرماتے ہیں:

فردوس چاندنی کی طرح پاک وصاف ہے
کیاہوگااس غریب کی پگڑی اچھال کر

اسی صاف گوئی اور اسلوب کی شیرینی میں فردوس گیاوی کا فنی کمال ابھرتا ہے۔جس کے

اندر عجز وانکسار کی نرمی، لہجے کو پُر وقار بناتی ہے۔ خیالات کو پاکیزگی بخشتی ہے۔ تہذیب و تمدن کو شائستگی عطا کرتی ہے۔ فردوس گیاوی نے اپنے اظہار کی تشکیل کے لئے صاف ستھری زبان کا استعمال کیا ہے۔ اپنے خواب محل کی تعمیر میں ایک ایک پتھر تراش خراش کر لگایا ہے۔ جس سے اس کی دلکشی اور جاذبیت میں چار چاند لگ گئے ہیں:

در در کا میں بنوں بھکاری کیا تجھ کو منظور یہی ہے
آخر کب تک کھانا پڑے گا میرے مولا ٹھوکر مجھ کو

رات تاریک راہ نا معلوم
اپنی یادوں کی روشنی رکھ دو

خشک ہونٹوں پہ کچھ نمی رکھ دو
طاق پر پھول بھی کوئی رکھ دو

خدا کا خوف تھا دنیا سے بھی محبت تھی
میں کشمکش میں تھا کوئی گناہ کر نہ سکا

زہرِ حیات کون یہاں آکے پی گیا
یہ کس نے رکھ دیا ہے سمندر کھنگال کر

ہمیں اچھی نہیں لگتی زمانے کی کوئی خوشبو
ہمارے دل میں جب سے بس گئی ہے آـ کی خوشبو

ان اشعار میں فردوس گیاوی کی شخصیت اپنے جمالیاتی حس کے ساتھ روشن ہوتی ہے اور ان کی نرم گفتاری میں اثر آفرینی کی دھیمی دھیمی آگ جلتی رہتی ہے۔ جس کی حدت دل و دماغ میں اُترتی ہوئی محسوس ہوتی رہے۔ یہی فردوس گیاوی کی فکری وفنی بصیرت ہے جسے بڑے احترام کے ساتھ یہ اپنی غزل میں ڈھالتے ہیں۔ جس سے اس کی خوش رنگ فضا تیار ہوتی ہے:

گذشتہ سال وہ زخموں کی دے گیا تھا بسنت
سنا ہے اب کہ وہ برسات لے کے آئے گا

فردوس گیاوی کے خیالات کی روانی دھیمی دھیمی چال کے ساتھ پُرسکون وادیوں سے گزرتی ہوئی ندی کی طرح ملتی ہے جو اپنی منزل کی طرف بہت آہستگی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ ان کے یہاں نہ جذبات کی شدت ہے نہ لہجے کی گرمی۔ کہیں بھی ترشی و تندی نہیں ملتی ہے۔ روایت سے گہری وابستگی برقرار رکھتے ہیں۔ غزل کا رشتہ نہیں توڑتے ہیں:

کاش سمجھیں زبان والے بھی
بے زباں کی دعا ہے خاموشی

انہوں نے اپنی غزل میں شہر اور گاؤں کا ذکر بار بار کیا ہے۔ یہ کبھی بھی اپنے گاؤں کی فضا سے باہر نہیں نکل پاتے ہیں۔ گاؤں کی سادگی اور معصومیت انہیں بھاتی ہے۔ شہر کی تیز روشنی انہیں راس نہیں آتی ہے۔ اس لئے ان کی کشمکش برقرار رہتی ہے اور یہ برابر اسی تذبذب میں مبتلا رہتے ہیں:

جو تم پہ گذری ہے اس کا ملال مت کرنا
فقیر شہر سے کوئی سوال مت کرنا

یہ شہر سنگ ہے کوئی سمجھ نہ پائے گا
بیاں کسی سے یہاں اپنا حال مت کرنا

ہے آج شہر میں آئینہ گر وہی فردوس
کبھی جو دیکھ کے آئینہ چیخ اُٹھتا تھا

شہر سے کل جو آنے والا ہے
اس کی خاطر بھی چاندنی رکھ دو

اس شہر میں اب کس پہ بھروسہ کرے کوئی
ہر شخص یہاں غازئ گفتار ہے بابا

ادب کے گاؤں چھوڑنے والے
کیسی ہے شہر کی ہوا لکھنا

شہر کا شور گاؤں کی چوپال
کون اچھا تمہیں لگا لکھنا

درد کے شہر میں ہے گھر میرا
میرے گھر کا پتا ہے خاموشی

ہمارے شہر میں سب نفرتوں کی آگ بوتے ہیں
بس اِک فردوس ہے جو بانٹتا ہے پیار کی خوشبو

راستے شہر کے خاموش نظر آتے ہیں
منظر کرب کوئی اور نیا دے مجھ کو

ان اشعار میں فردوس نے اپنی زندگی کے شہری تجربوں کو پیش کیا ہے شہر میں رہکر جو کچھ محسوس کیا ہے اسے اپنی شاعری میں ڈھال دیا ہے شہر کی سنگ دلی، بے حسی، نا اہلی، ناانصافی، جھوٹی تسلی اور لفاظی انہیں راس نہیں آتی ہے۔شائد اسی لئے گاؤں کی فضاء ان کے دل و دماغ میں بسی ہوئی ہے۔اوب کے مگر گاؤں چھوڑنے والوں سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں شہر کے شور اور گاؤں کی چوپال میں کیا فرق رہ گیا ہے سیاسی نظریے نے نفرت کی آگ تمام پھیلا دی ہے گاؤں بھی اب شہر کے جیسا ہو گیا ہے ان سب حالات کے باوجود بھی گاؤں کا بھولا پن انہیں کھینچتا نظر آتا ہے۔

فردوس گیاوی کی شاعری اپنے آس پاس کے مسائل اور الجھنوں کی پکار ہے۔جس کے اندر زندگی کی آواز سنائی دیتی ہے مگر یہ آواز گھن گرج کے ساتھ چیختی چلاتی ہوئی نہیں ملتی ہے۔یہ اپنے قاری اور سامع کو خوش الحانی کے ساتھ بلاتی ہے اور دعوتِ فکر دیتی ہے۔

☆

شاہد اختر

نام:	شاہد اختر
ولدیت:	حافظ انوار الحق
تاریخ پیدائش:	۱۵ اپریل ۱۹۶۲ء
تعلیم:	ایم، اے (اردو) پی۔ ایچ، ڈی (جاری)
وطن:	سہسرام
پتہ:	محلہ مغل پورہ، سہسرام (رُہتاس)
پیشہ:	ملازمت (گیا کالج، گیا)
تصانیف:	تمہید۔ شعری مجموعہ (زیر طباعت)
	پھرتا ہے فلک برسوں

شاہد اختر

''زخم ایسا ہے کہ ہر آنکھ تماشائی ہے''

شاہد اختر کئی برسوں سے غزل کی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں۔ رسائل میں برابر چھپتے رہتے ہیں۔ میرے اچھے دوستوں میں ہیں۔ میں ان کی دوستی کی قسمیں کھا سکتا ہوں۔ بڑے سلیم الطبع اور خوش مزاج انسان ہیں۔ ان کے ساتھ قدرت کی بہت بڑی ستم ظریفی ہوئی ہے۔ سنامی لہروں نے ان کی اہلیہ اور اکلوتے لخت جگر کے ساتھ ان کے خاندان کے پانچ لوگوں کو غرق آب کر دیا۔ یہ بھی اسی موج ستم کی زد میں تھے مگر اُس سے بچنا ان کا مقدر تھا اس لیے انھیں موت کے بے رحم جلاّد سے نجات حاصل ہوگئی۔ دُور پردیس میں اس طرح کا حادثہ ہونا اور پھر اس میں ثابت قدم رہنا کوئی عام بات نہیں ہے۔ ان کے ذہن و دل پر بربادیوں کے نقش موجود ہیں مگر انھوں نے زندگی کے حقائق کو پہچان لیا ہے۔ غموں کی کشمکش سے نجات کا راستہ ڈھونڈ لیا ہے اور زندگی کی پکار سن لیا ہے۔ نئے حوصلوں کے ساتھ ایک نئی راہ میں قدم بڑھا چکے ہیں۔ جس کی روشنی کچھ اس طرح ان کی غزل میں موجود ہے۔

الگ تھلگ یہاں خود سے گزاریے کوئی دن
نئے سلیقے سے اپنا سنواریے کوئی دن

بدل چکا ہے بہت کچھ مزاج موسم کا
بدن سے موم کا زیور اتاریے کوئی دن

عجب نہیں کہ وہی موتیوں سے بھرنے لگے
پھر اس کے سامنے دامن پساریے کوئی دن

ہرا نہ کر دے کہیں زخم دل وہ بارِ دگر
دراز ہوتی سی خواہش کو ماریے کوئی دن

کسی کو وصل پہ آمادہ کیجئے کوئی شام
گذارنے کی طرح سے گزاریے کوئی دن

نگاہ میں جو چمکتا ہے مہر عالم تاب
اسے فلک سے زمیں پر اتاریے کوئی دن

کھلے گا رزنِ خواب طلسم بھی اختر
وہ نقش آئینہ خانہ اُبھا ریے کوئی دن

شاہد اختر کی زندگی کو سمجھنے کے لیے ان کی یہ غزل بہت اہم ہے۔ میں ان کے فکرفن پر اسی غزل کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس غزل میں ان کے ماضی حال مستقبل کے نقش ونگار موجود ہیں۔

مطلع میں شاعر اپنے دکھ درد کی کیفیت کو نشاطیہ بیان کرتا ہے۔ جب اس پر غم واندوہ کی بجلی گرتی ہے آرام ومصائب سے زندگی مضمحل ہوتی ہے تو وہ تنہائی چاہتا ہے کچھ پل کے لیے سکون تلاش کرتا ہے۔ غالب نے بھی اسی کیفیت کے لیے کہا تھا۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

اور یوں بھی کہا تھا۔

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

شائد اسی خیال کو شاہد اختر نے بھی اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے مگر تنہائی نصیب ہوتے ہی شاعر اپنی زندگی کی حقیقت و معرفت کو پہچان لیتا ہے۔ اپنے غموں سے سمجھوتا کر لیتا ہے۔ دنیا کے ساتھ بڑھ کر قدم سے قدم ملا لیتا ہے۔ خزاں سے بہار کی طرف یہ کہتے ہوئے لوٹ جاتا ہے۔

بدل چکا ہے بہت کچھ مزاج موسم کا
بدن سے موم کا زیور اتاریے کوئی دن

اور وہ جب زندگی و موت کے فلسفے کو پہچان لیتا ہے تو **انا للہ و انا الیہ راجعون** سے سبق حاصل کرتا ہے اور ایک نئی روشنی تلاش لیتا ہے۔ یہی روشنی اُسے ربِّ کریم کی طرف رجوع کرتی ہے جو سارے جہان کا رب ہے۔ جس نے خوشی کے ساتھ غم، رات کے ساتھ دن، اندھیروں کے ساتھ روشنی کا تضاد قائم کیا ہے اور دھوپ چھاؤں کے اس کھیل کو وقت کے پہیے میں ڈال کر چھوڑ دیا ہے شاعر یہیں سے اُمید کی کرن جگمگا لیتا ہے ؎

عجب نہیں کہ وہی موتیوں سے بھرنے لگے
پھر اُس کے سامنے دامن پسارے کوئی دن

جب اسے غم حیات کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ زخم دل کا علاج کچھ اس طرح کرتا ہے

ہرا نہ کر دے کہیں زخم دل وہ بارِ دگر
دراز ہوتی سی خواہش کو مارے کوئی دن

پھر شاعر شام فراق نہیں شب وصال پسند کرتا ہے رجاعیت کا دامن تھام لیتا ہے۔ قنوطیت کو چھوڑ دیتا ہے۔ کسک اور گھٹن بھری زندگی کی بجائے کیف و نشاط کے ساتھ یہ کہتے ہوئے جینا چاہتا ہے ؎

کسی کو وصل پہ آمادہ کیجئے کوئی شام
گزارنے کی طرح سے گزاریے کوئی دن

اپنے ماضی کو مہر عالم تاب کا نام دے کر روشن کر دیتا ہے یہ اس کا فنی کمال ہے اور فکر و آگہی کی نئی روشنی ہے۔

نگاہ میں جو چمکتا ہے مہر عالم تاب
اُسے فلک سے زمیں پر اُتاریے کوئی دن

اور اپنا روزن خواب طلسم یوں کھولنا چاہتا ہے۔

کھلے گا روزن خواب طلسم بھی اخترؔ
وہ نقش آئینہ خانہ اُبھاریے کوئی دن

شاہد اختر کی غزلوں سے چند اور اشعار پیش کر رہا ہوں جن سے ان کے فکر فن کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے

پا برہنہ ہیں اب کے جنگل میں
تو بھی میں بھی طلب کے جنگل میں
خاک خواہش بھی اب نہیں اُڑتی
خون کے تاب وتب کے جنگل میں

بہت جی چاہتا ہے اس کی خاطر کچھ بچا رکھوں
مگر اتنی گرانی ہے کہ ہوتا کچھ نہیں ہے

ہر ایک شخص کا چہرہ ہے آنکھوں سے محروم
ہر ایک شخص کے سینے میں ہے مشین کا دل

میں اس کا درد سمجھ لوں گا یہ یقین سا ہے
کسی فقیر کو ہی راز داں کرے گا فقیر

گل مراد کے ہونٹوں پہ میرے لب ہوں گے
مری زمین کو جب آسمان کرے گا فقیر

ناپسندیدہ یہ اختر زندگی
آ گئی ہے ایک چوتھائی پسند

اس طرح میری پزیرائی نہ کر
ہو نہ جاؤں میں پزیرائی پسند
کوئی منظراب کہیں روشن نہیں
جس کو کرتی میری بنیائی پسند

شاہد اختر کی غزلیں نئی نسل کی نمائندگی کرتی ہیں ان کی غزلوں میں عصری حسیّت ، زندگی کی کربنا کی ،تنہائیوں کا درداور بے یقینی و بے زاری کے نقوش اُبھرتے رہتے ہیں۔ان میں رجاعیت کی روشنی ملتی ہے۔زبان بھی بہت صاف ستھری استعمال کر تے ہیں اپنے مسائل کوسادگی سے بیان کرتے ہیں تہذیب وتمدن کے ساتھ شعر برتنے کاہنر جانتے ہیں۔

☆

خورشید اکبر

نام: محمد خورشید عالم

ولدیت: زین العابدین

تاریخ پیدائش: ۵؍جولائی ۱۹۵۹ء

تعلیم: ای۔اے۔(اردو پولٹیکل سائنس)

وطن: بڑھیا (مونگیر)

پتہ: بُک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

پیشہ: ملازمت (بہار ایڈمنسٹریٹو سروس)

تصانیف: سمندر خلاف رہتا ہے (شعری مجموعہ۔۱۹۹۴ء)

خورشید اکبر

خورشید اکبر نئی نسل کی معتبر آواز ہیں ان کی غزلوں میں زندگی کے رنگا رنگ مسائل اُٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فکروآ گہی کی شمع روشن کر کے کرب ناک اندھیروں کا حل ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ وقت کی ستم ظریفی، دھوکہ دھڑی، سیاسی تبدیلیوں کی اٹھا پٹک، مادہ پرستی کے شکار انسان، حرص و ہوس کی ہوا باطنی تقدس کی پامالی، ضمیر فروشی کا کھیل اور دولت وثروت کا نشہ ان سب موضوعات کو انھوں نے شعری لبادہ پہنایا ہے۔ ان کے یہاں زیادہ تر اسی قبیل کے اشعار ملتے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زمیں پہنی گئی اور آسماں اوڑھا گیا برسوں
بدن کی خانقاہوں میں خدا سویا رہا برسوں

ایمان شکن پیکر دوشیزۂ عالم
سب کچھ ہے ترے پاس جوانی کے علاوہ

کم ظرف مصلحت کو ملی مسندِ عظیم
خوددار حوصلوں کی نوازش نہ ہوسکی
یزیدِ وقت کو دنیا قبول کرلے گی

سناں کی نوک پہ اک سر خلاف رہتا ہے

قناعت ہے کسی مفلس کی بیوی
ریاست داشتہ پر چل رہی ہے

غریبی جھانکتی ہے تہہ بہ تہہ پیوند سے باہر
مگر ہم جیب پر احسان کا بخیہ نہیں رکھتے

بہشت رنگ مرادوں کی جانمازوں پر
منافقوں کی سیاست ابھی نہ رکھی جائے

ان اشعار میں دنیا کا حال آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ زمانہ کس طرف جا رہا ہے یا کیسا ہے انھوں نے اخبار کی سرخیوں کو غزل کے چہرے پر چپکا دیا ہے۔ جس کی جھلک ان کے اشعار میں زیادہ تر ملتی ہے۔ اسی قبیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آ کشتی فردوس! مرے دل کی طرف آ
پنجاب کے سینے پہ میں کشمیر اتاروں

مرے اصول کے بچّے بھی احتجاجی ہیں
ذرا جھکوں تو مرا گھر خلاف رہتا ہے

مرے وجود سے برہم لباس دنیا ہے

کہ خود کوشہ کا مصاحب نہیں کہا میں نے

دل کی مشقتوں کا صلہ درد بھی نہیں
ایسا نہ ہو کہ! اجرت مزدور جائے گی

گم ہوئی عزت سادات نسب ناموں میں
یہ الگ بات کہ اب میر بدل سکتا ہے

عصری مسائل کے بوجھ، اضطراب، انانیت، عدم مساوات ،سیاسی باز یگری، اخلاقی گراوٹ اور حرص و ہوس کا زور انھیں موضوعات کو اپنی شاعری میں خورشید اکبر نے پرویا ہے جس میں لہجوں کی تلخیاں، مزاج کا باغیانہ پن اور احتجاج کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔

عالم خورشید

نام: محمد خورشید عالم خاں

ولدیت: عبدالرشید خاں

تاریخ پیدائش: ۱۱ر جولائی ۱۹۵۹ء

تعلیم: بی۔کام آنرس، بیچلر ان جرنلزم

وطن: آرہ

پتہ: ڈائرکٹوریٹ اکاؤنٹس (پی) ایگزبیشن روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱

پیشہ: سنیئر اکاؤنٹینٹ (مرکزی حکومت)

تصانیف: ۱۔ نئے موسم کی تلاش (شعری مجموعہ ۱۹۸۸ء)

۲۔ زہر گل (شعری مجموعہ ۱۹۹۸ء)

عالم خورشید

عالم خورشید کی غزلوں کے اشعار سے زندگی کی دھڑکنوں کا پتا چلتا ہے جو قائم رہنے کے لیے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتی رہتی ہے۔ان کے اشعار کسی ایک مرکز پر ٹھہرے ہوئے، دکھائی نہیں دیتے ہیں بلکہ مختلف راہوں میں رواں دواں اپنی منزل ڈھونڈتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ایک پیڑ پر رہنے والے ان پرندوں کی طرح ہیں جو صبح ہوتے دانہ پانی کی تلاش میں مختلف سمتوں کی طرف اڑان بھر دیتے ہیں اور پھر شام ہوتے ہی اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ان کی فکر و آ گہی کا پرندہ کچھ اس طرح اُڑان بھرتا ہے:

اس پیڑ سے خود ٹوٹ کے اب پھل نہیں گرتے
تو کب سے کھڑا ہے کوئی پتھر تو چلا بھی

سمندر کی چٹانوں نے کہیں تو راستہ روکا ہے پانی کا
اُبھرتی ڈوبتی لہروں میں ورنہ سرکشی کا کیا سبب آخر

تاریکی میں زندہ رہنا ہم کو نہیں منظور
جگنو سا تابندہ رہنا ہم کو نہیں منظور

زمانے کے تغیر نے مزاج اپنا نہیں بدلا
حویلی سے سڑک پر آگیے ہم کجکلاہی میں

صبح سویرے آنگن اپنا گونج اُٹھے چہکاروں سے
توتا مینا بلبل یا سرخاب کہاں رکھتے ہیں ہم

خاک سے لپٹے ہوئے خون میں تر آئے ہیں
صبح کے بھولے تھے ہم شام کو گھر آئے ہیں

عالم خورشید کو کب گھر لوٹنا چاہیے اس کا احساس ہے۔ وہ غزل کی روایت سے بھی واقف ہیں اور اس کی جدت سے بھی آشنا ہیں۔ اشعار بہت صاف ستھرے دیکھ بھال کر کہنا جانتے ہیں۔ زندگی کے مسائل اور اُس کی پکار کو بھی سنتے ہیں۔ زمانے کے حالات سے بھی باخبر ہیں مگر لہجے میں کرختگی کی احتجاجی آواز سنائی دیتی ہے۔ درج ذیل اشعار میں لہجوں کی گرماہٹ محسوس کیجئے۔

تیر بن کر ضبط کی فتراک سے باہر نکل
اشک گریہ! دیدۂ نمناک سے باہر نکل

لہولہان ہوا میں لہو کہاں بولا
سبھی تھے غیر مرے بھائی تو کہاں بولا

اس یقیں نے تو کہیں کا بھی نہ رکھا عالم
وہ تو دیگا ہی مرے حق میں بیاں کچھ بھی ہو

سرکشی پہ آ گئی ہیں میری لہریں اے خدا
میں سمندر ہوں مرے سینے میں بھی چٹان رکھ

کسی کو آب کا وعدہ ہمیں سراب ملے
امیر شہر سے سب کو حسین خواب ملے

اسی قبیل کے اشعار سے ان کی غزلیں بھری پڑی ہیں۔ جلتے ہوئے جذبات کی آگ بہت تیز ہے مگر کہیں کہیں شبنمی احساس کی بوندیں بھی ٹپکتی ہیں۔ جن سے ایک نئی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نیا سرور ملتا ہے۔ درج ذیل اشعار اسی کے غماز ہیں۔

میں اسکے نیچے کھڑا بھیگتا رہا عالم
وہ اک چٹان، بہت دیر تک پگھلتی رہی

ہمارے عہد کا محبوب ہی کچھ ایسا ہے
ہمارا کام نہیں چلتا ہے کنائے سے

ساری دنیا کا تعلق ہے اسی کے دم سے
رشتۂ درد جہانگیر ہمیں لگتا ہے

میں کب سے بیٹھا ہوں ہاتھوں میں اپنا دل لے کر
وہ دل نواز کبھی اس طرف بھی آئے تو

گھر، خواب، آنکھ، دھوپ، بارش، سمندر، چراغ، خوشی، رات، شاخ، آفتاب، ساحل، کنارہ، عمارت، کبوتر، حویلی، شرارہ، ستارہ، سڑک، موسم، شہر، شام، صبح، اجالا، اندھیرا، ناکامی، کامیابی، موج، لہر، روشنی، ہوا، رنگ اور خوشبو وغیرہ الفاظ ان کی غزلوں میں بطور استعارہ قدم قدم پر ایک نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ ملتے ہیں جو ان کے شعری پیکر میں ڈھل کے ان کے فکر و فن کی تصویر بناتے ہیں۔

☆

سرور ساجد

نام: غلام سرخاں

ولدیت: زین اللہ خاں

تاریخ پیدائش: ۵ فروری ۱۹۶۴ء

تعلیم: ایم۔اے (اردو) پی ایچ۔ڈی

وطن: رانچی

پتہ: نظیر خان لین، مین روڈ رانچی ۸۳۴۰۰۱

پیشہ: درس وتدریس

تصانیف: ۱۔ کاغذی چھتری (مختصر مجموعہ۔۱۹۹۰ء)

۲۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کی غزل کا اسلوبیاتی مطالعہ (تنقید۔۱۹۹۴ء)

سرور ساجد

سرور ساجد نئی نسل سے تعلق رکھنے والے ایک اچھے شاعر ہیں۔ رانچی یونیورسیٹی میں شعبہ اردو سے منسلک ہیں۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ کئی سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں۔ اپنی زندگی کو انھوں نے بہت مصروف ترین بلکہ کمپیوٹر بنا دیا ہے بیک وقت ہزاروں طرح کے افکار مسائل میں گھر کر" سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" کی راہ پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر عنوان چشتی کا یہ شعر ذرا سا ترمیم کے ساتھ ان پر فٹ دکھائی پڑتا ہے۔

فقیر عشق سے ملیو ضرور رانچی میں
وہ ایک شخص نہیں مستقل ادارہ ہے

اتنی مصروفیت کے بعد پتا نہیں غزل گوئی میں کس وقت لہو جلاتے ہیں جس سے ان کی غزلیں اتنی روشن اور تابناک ہو جاتی ہیں کہ ان سے فکر و معنی کی روشنی پھوٹنے لگتی ہے۔ ان کی غزلوں میں زمانے کا عکس موجود ہے۔ خوف بے چینی انتشار، خامشی، دکھ درد کو اپنا اثاثہ سمجھتے ہوئے یوں فرماتے ہیں۔

تڑپنا تلملانا، خوف، خاموشی، گھٹن رونا
خزانے میرے تھے سوان پہ قبضہ کر لیا میں نے

سرور ساجد بڑی سادگی کے ساتھ اپنی بات شعروں میں ڈھال دیتے ہیں۔ زبان و بیان میں کوئی الجھاؤ نہیں رکھتے۔ "ادب برائے زندگی" کے فارمولے

پر چلتے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔حالات حاضرہ کی جھلک پیش کرتے ہوئے ان کے چنداشعار ملاخطہ فرمائیں۔

ہماری قربتیں ہی زندگی ہیں
سو مردہ فاصلوں کو دفن کر دو

مذہب کی گود سر پہ سیاست کا آسماں
اب ملک کے فساد میں بچپن نہیں رہا

اپنی ترقیوں کی اڑانیں نہ پوچھیے
گھر تنگ ہو گئے کوئی آنگن نہیں رہا

ایک رشتے کے ٹوٹ جانے پر
جلد بازی میں دوسرا نہ بنا

بس ایک شب کو تری چھت قبول کر لی ہے
یہ مت سمجھ کہ امامت قبول کر لی ہے

اجالوں کو کسی صورت بچا لو
اندھیرا چاروں جانب بڑھ رہا ہے

سرور ساجد کے یہاں زمانے کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ان کی شاعری اپنے عہد کی آئینہ دار ہے۔اور یہی آئینہ گری ان کا فنی کمال ہے۔زندگی میں

رونما ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات سے اپنے اظہار کا پیکر چن لیتے ہیں اور انھیں شعریت کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ اسی خیال کی ترجمانی کرتا ہوا یہ شعر پیش ہے۔

زمین تنگ ہوئی آشنا عدو سے ملے
غریب شہر نے ہجرت قبول کر لی ہے

ان کی طبع سلیم میں محبت بھری شوخیاں بھی ملتی ہیں۔ جو مومن کی شاعری کا خاص طرۂ امتیاز رہا ہے اور یہی انفرادیت مومنؔ کو غالب پر غالب کر دیتی ہے۔ مومنؔ کا ایک شعر ہے۔

تو ہے ہرجائی اگر تیرا یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

اسے سرور ساجد اپنے انداز میں یوں بیان کرتے ہیں۔

سرمنڈل کے تار بدلتے رہتے ہیں
یاروں کے دلدار بدلتے رہتے ہیں

مومنؔ جیسی بات حالانکہ سرور ساجد کے شعر میں نہیں ہے۔ مگر مومنؔ کا رنگ ان کے شعر میں ضرور جھلکتا ہے۔ یہ ان کی شوخیوں اور نزاکتوں سے فیض اُٹھا کر اپنی منزل تلاشتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چند اشعار جن میں مومن کی شوخیوں، نزاکتوں اور لطافتوں کے رنگ جھلکتے ہیں۔ جن میں محبت کی چبھن اور کسک بھی محسوس ہوتی ہے عرض ہیں:

کسی کی مسکراہٹ بھا گئی ہے
ہمارے سامنے دنیا نہ رکھو

دو چار دن کے بعد چلا جائے گا کہیں
ہر اجنبی پرند کو چاہا نہ کیجئے

میرا چہرا ہ بگاڑنے والے
تجھ کو تحفہ میں آئینہ دوں گا

یہ ریشم سے رشتے یہ چہروں پہ چہرہ
کتابوں میں کیا کیا پڑھا کیجئے گا

سرور ساجد آنے والے وقت میں ایک اچھے غزل گو کی حیثیت سے پہچان بنائیں گے۔اللہ ان کے ذوق سفر کو کامیاب کرے۔میں اپنی بات ان کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں۔

شوق سے آپ نئی سمت سفر میں رہیے
التجا اتنی ہے بس حد نظر میں رہیے

تنویر احمد عثمانی

نام: تنویر احمد عثمانی

ولدیت: پروفیسر محمد ایوب انصاری

تاریخ پیدائش: ۲۴/اگست ۱۹۷۱ء

مقام پیدائش: شاہ پور پٹودی، ضلع سمستی پور

مجموعہ: زیر ترتیب شعری مجموعہ "فصل گل"

آغازِ شاعری: ۱۹۸۲ء

تعلیم: M.B.A., L.L.B.

ملازمت: ڈیولپمنٹ آفیسر ایل آئی سی آف انڈیا

گیا برانچ۔۱

پتہ: ڈاکٹر اظہر حسین کیمپس

روڈ نمبر ۴، وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا

فون نمبر: 0631-2432151

موبائل: 9431416130

تنویر احمد عثمانی

تنویر احمد عثمانی میری فہرست کے آخری شاعر ہیں۔ ایل آئی سی آف انڈیا میں ڈیولپمنٹ آفیسر کی پوسٹ پار فائز ہیں۔ شاعری اور موسیقی سے لگاؤ ہے یوں تو ان کی شاعری کا اغاز ۱۹۸۲ء ہے۔ مگر بہت دنوں تک ہندی رسم الخط سے جڑے رہے۔ شاہد اختر جیسے دوستوں کے مشورے پر اب اپنی شاعری کو اردو رسم الخط کا لباس بھی دینے لگے۔

تنویر احمد عثمانی زندہ دل انسان ہیں۔ نئی غزل کی نئی کونپل ہیں۔ اس لئے میں نے انہیں بھی اپنی فہرست میں شامل کیا کیونکہ آنے والا عہد انہیں کونپلوں سے بہاروں کی شادابیوں کو لائے گا۔ جس سے زینت گلشن کا نظام قائم ہوگا۔

تنویر احمد عثمانی اپنی غزل میں بڑے صاف ستھرے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اپنے خیالات کو گنجلک اور پیچیدہ نہیں بناتے ہیں بلکہ آمنے سامنے کی بات کرتے ہیں مگر ان کی شاعری میں جمالیاتی حس نغمگی بکھیرتی ہے جس سے شگفتگی اور شائستگی کا لطیف جذبہ انگڑائیاں لیتا ہے۔

یہ اس کے فن کی نمائش ہے یا کہ فطرت ہے
وہ ہم سے آج بھی ملتا ہے مہرباں کی طرح

بدلا موسم گاؤں کا میرے ساون میں گھر جلنے لگے
تم بھی کہو کچھ شہر تمہارا کیسا ہے معلوم نہیں

فصل چمن برنگ گل ولالہ کھل اٹھی
جیسے خزاں سے اس کو سروکار ہی نہیں

خون جگر ہمارا بھی رکھنا سنبھال کر
ہاتھوں پہ تیرے رنگ حنا دے رہے ہیں ہم

یہ اشعار غنایت کی بھرپور طاقت رکھتے ہیں۔فکرو معنی کی وسعت تو نہیں ملتی ہے مگر زبان و بیان کا لطف ضرور ملتا ہے۔تنویر احمد عثمانی کبھی کبھی سادگی کے ساتھ بہت اچھی بات بھی کہہ جاتے ہیں۔جس کے اندر اثر آفرینی کا لطف ملتا ہے۔

تنویرؔ اپنے لب سے ہنسی دور ہے مگر
دنیا کو قہقہوں کی ادا رہے ہیں ہم

تنویر نے جو محسوس کیا ہے اسے خیالات کا جامہ پہنایا ہے۔زندگی کو جیسا دیکھا ہے ویسا ہی روپ رنگ اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔کسی مبہم بات کہنے کے قائل نہیں ہیں۔ ابہام گوئی سے بھی بچتے ہیں ان کے یہاں زندگی کی تصویر بہت صاف ستھری ملتی ہے۔

چلے بھی آؤ ذرا تم سنوار دو مجھ کو
مرا وجود ہے اجڑے ہوئے مکاں کی طرح

تنویر احمد عثمانی کی شاعری کے بارے میں ابھی کچھ کہنا تو قبل از وقت ہی ہوگا مگر ان کی شاعری کے اندر روشنی کی ایک کرن ملتی ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آنے والے وقت میں اگر یہ طبع سلیم کو ذوق وشوق میں کوشاں رکھتے ہیں تو منزل ان کے لیے آسان ہو جائے گی۔لیکن اس منزل کی تلاش و جستجو میں ابھی انہیں ہزاروں پر پیچ راہوں سے گذرنا ہوگا۔کئی اگنی پریکشا دینی ہوگی۔تب انہیں یہ صنف کا فرمنھ لگائے گی اور فکروفن کی سوجھ بوجھ ہاتھ آئے گی۔اس کے بعد تو فکروفن کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔میں امید کرتا ہوں کہ تنویر عثمانی اپنے عزائم اور حوصلوں کو برقرار رکھیں گے اور ایک دن اس بحر بے کراں کے شناور ہوں گے۔

☆

JADEED GHAZAL

(EK TAJZYATI MOTALA)

2006
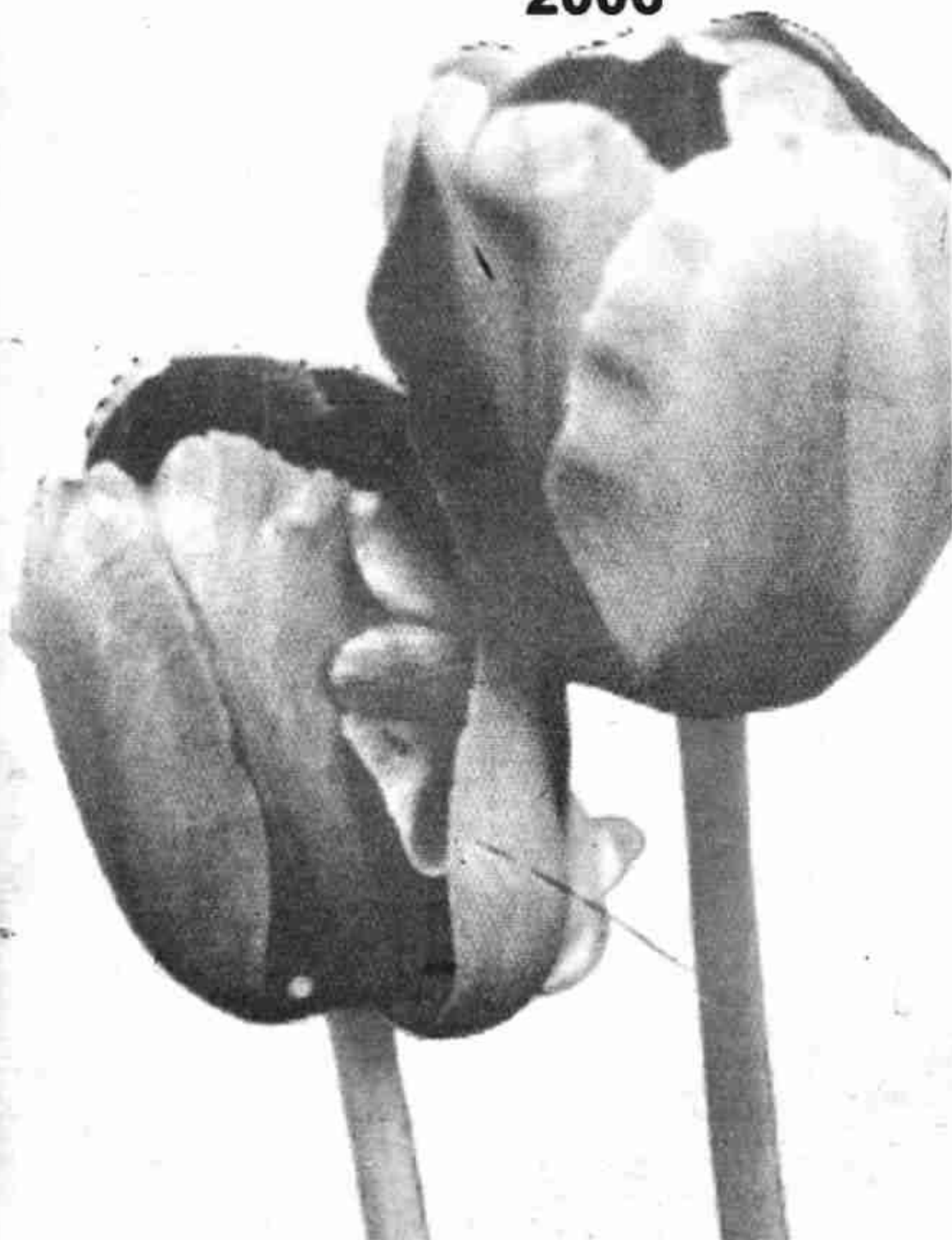
By

DR. ASHHAD KARIM ULFAT

Ahmadpur, Rafiganj, Aurangabad

(Bihar)